

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU-234367**

UNIVERSAL  
LIBRARY











# نیرنگ خیال

حصہ اول

# فہرست مطالب

صفحہ	مضمون
۱	دوسیا چہ
۶	اُردو اور انگریزی انشا پروازی پر کچھ خیالات
۱۷	آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا
۲۷	سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ
۳۴	گلشن اُمید کی بہار
۴۲	سیر زندگی
۵۰	انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا
۵۷	علوم کی بد نیسی
۷۰	علیت اور ذکاوت کے مقابلے
۸۰	شہرت عام اور بقاے دوام کا دربار
۹۸	خاتمہ
۱۰۰	نظم اُردو
۱۰۱	مضمون لکچر
۱۰۸	شام کی آمد اور رات کی کیفیت



تماشا گاہ عالم میں جو اہل نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حالِ استقبال کی سیر دیکھ رہے ہیں انہیں صاف نظر آتا ہے کہ ملک ہمارا عنقریب ایک آفریضِ جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا جاتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں۔ نئے نئے فنون ہیں۔ سب کے حال نئے ہیں۔ دل کے خیال نئے ہیں۔ عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں۔ رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلبیات کو دیکھ کر عقل رسا حیران ہے۔ مگر اسی عالمِ حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولزیشن (تندیب) کی سواری شانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانہ کو جھاڑ بھار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے۔

جو نقشے کھینچ رہے ہیں اور جو بنیادیں پڑ رہی ہیں اگر یہ ابھی تک کچھ اہل نہیں رکھتے۔ لیکن جو نظر باز تجربہ کی عینک سے دیکھ رہے ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ بنیادیں آسمان سے بائیں کرنے لگیں گی۔ اور آبادیاں روئے زمین پر چسبنا بیٹگی۔ وہ بنیادیں کیا ہیں؟ اور نقشوں سے کیا مراد ہے؟ ان نقشے کتبِ علوم و فنون میں۔ اور بنیادیں تصانیفِ بوقلموں کہ جو کچھ سو و بہود ہماری قسمت میں ہے انہی پیمانوں اور اندازوں پر نہیں مایگا۔

اب تک اس ملک نے اپنی غریب حالت کے بوجہ بہت سا سرمایہ ضیاع کیا ہے۔ پچھلے ۵۰-۶۰ برس پیچھے ہٹ کر کھینچیں تو ہمارے عام مطالبہ و اغراض بلکہ بات بات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ

علوم و فنون انگریزی جن طرح ہمارے لباس - مکانات - حالات - خیالات اور معلومات سابقہ میں ترمیم کر رہے ہیں۔ اسی طرح اُس کی انشا پر دوازی بھی ہماری انشا میں صلح دیتی جاتی ہے۔ لیکن علم زبان میں اس فرق کا امتیاز کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ جنہیں اس کا مذاق ہے۔ وہی سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں جو کچھ اُردو کا رنگ نکلا تھا۔ سبزہ خود رو کی طرح نکلا تھا۔ خاص نام کے دلوں کی اُمتگ تھی۔ جدھر جھک گئے ادھر جھک گئے۔ خاص شخص کی یا خاص اُصول کی کوشش نہیں ہوئی اور اب تک یہ حال ہے کہ تاریخ۔ فروع ریاضی وغیرہ اکثر علوم کی کتابیں ترجمہ اور تصنیف ہوئیں۔ مگر فنِ انشا کی طرف کسی نے خیال نہیں کیا۔ زبان اُردو ایک لا وارث بچہ تھا کہ اُردو سے شاہجہانی میں پھرتا ہوا بلا کسی کو اس غریب کے حال کی پروا نہ ہوئی۔ اتفاقاً شعرا نے اُٹھالیا۔ اور محبت سے پالنا شروع کیا۔ اُس نے اُنہی کے کھانے سے خوراک پائی۔ اُنہی کے لباس سے پوشاک پہنی۔ اُنہی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا۔ اسی واسطے انہی کی زبان سے بولنا سیکھا۔ اُنہی کے قابوں پر چلنا سیکھا۔ انہی کے خیالات اس کے دل وماغ میں سمائے۔ حالت اس کی یہ رہی کہ علماء تو درکنار۔ اونے اونے آدمی اُردو میں لکھنا ہتک سمجھتے تھے۔ جب شہزادہ عین اُس نے دفاتر سرکاری میں دخل پایا ساتھ ہی انباروں پر قبضہ ہو گیا۔ تب لوگوں کی نظروں میں عزت و وقار ہوا۔ اور رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر قابض ہو گیا +

غرض کہ زبان اُردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے وہ شہزادے ہند کی کمائی ہے جنہوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے۔ یہ منسل زبان علمی الفاظ میں تو اس لئے تہید دست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ عام مطالبہ کے ادا کرنے میں بھی منسل ہے۔ چنانچہ اگر تاریخ یا کسی قسم کی سرگذشت اس زبان میں لکھیں تو جو اصلی حالت یا اپنے دل کا ارمان ہے وہ نہیں نکل سکتا۔ اسی واسطے اس کا اثر بھی جیسا کہ جی چاہتا ہے پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہنچتا۔ بات یہ

ہے۔ کہ اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ انشا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی۔ لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی۔ وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی۔

اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور ہے۔ مضامین عاشقانہ گلگشتِ مستانہ۔ نصیبوں کا رونا۔ امید مہوم پر خوش ہونا۔ امر کی ثنا خوانی جس پر خفا ہوئے اُس کی خاک اُڑانی۔ البتہ ان رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجہ تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔ اور اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیروہ اُس کے پاس ہے۔ فارسی میں صد ہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں۔ جن کے خیالات باریکی اور نازکی عبارت میں جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں کوئی اصلی اجزا اور کرنا چاہو تو ممکن نہیں۔ ایسی ماں کا دو دپی کر اُردو نے پرورش پائی تو اُس کا کیا حال ہوگا۔ اے اہل وطن۔ آج وہ دن ہے کہ علوم کے ایوانِ شانہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ ہر ایک زبان اپنے اپنے ملک کی خدمتیں لیکر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پر قائم ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری زبان کون کون پر کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت اونے درجہ پر ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر کوئی بڑھانے والا نہیں۔ اہل اُس کا بڑھانا تمہارے ہاتھ میں ہے۔

زبان انگریزی بھی مضامین عاشقانہ۔ قصہ و افسانہ اور مضامین خیالی سے مالا مال ہے مگر کچھ اور ڈھنگ سے۔ اُس کا اصل اصول یہ ہے کہ جو سرگذشت بیان کرے اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور شتر اُس کا دل پر کھٹکے۔ اسی واسطے خیالی پھول پتے اتنے ہی لگاتے ہیں جتنے اصل ٹہنیوں پر جتتے ہوں۔ نہ کہ شاخ و شجر سب غائب ہو جائیں۔ فقط پتوں کا ڈھیر ہی رہ جائے۔ بیشک فنِ انشا اور لطیفِ زبان تفریحِ طبع کا سامان ہے۔ لیکن جس طرح ہمارے مناخرین نے اسے ایک ہی مرض کی دو آئینے لیا ہے۔ انگریزی میں ایسا نہیں۔ اہل فرنگ نے جس طرح

ہر امر کی بنیاد ایک نفعیت پر رکھی ہے۔ اسی طرح اس میں بھی موقع موقع سے مختلف منافع ملاحظہ رکھے ہیں۔ زبان انگریزی میں نظم کا طور تو کچھ آؤر ہی ہے۔ مگر شہر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعت خیال۔ اور پرواز فکر۔ اور تنازگی مضامین۔ اور طرز بیان کا انداز قابل دیکھنے کے ہے۔ میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں۔ جنہیں یہاں (اسے) جو اب مضمون کہتے ہیں۔ ان میں انواع و اقسام کی غرضیں ملحوظ ہیں مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی ہمارے دل و دماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے تو اے عقلی یا جو اس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انہیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے۔ اور ان کے معاملات اور ترقی و تنزل کو سرگذشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شاگستگی طبع کے علاوہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفت پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلق بد سے نفرت ہو یا کسی حصول مطلب کے رستہ میں جو نشیب و فراز آتے ہیں۔ ان سے واقف ہو۔ اگرچہ ان میں طرز بیان کا طور وہ نہیں جو ہم اردو فارسی میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی فصیح اردو زبان پر قادر ہو۔ تو انہیں پڑھے۔ اور ان کے رنگ سے اپنے کلام کے چہرہ حال کو ایسے خط و خال سے آراستہ کر لے کہ خاص و عام کی نظروں میں کھب جائے۔ البتہ ایسی قدرت حاصل ہونی مشکل ہے اور مشکل تیر ہے کہ انگریزی میں یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسوم قدیم کی باتیں اب تک انشا پردازوں کا جزو ہیں۔ رومی و یونانی ستارہ ماے فلکی اور اکثر تو اے روحانی کو دیتا مانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے انشا پرداز وہی کہلاتے ہیں جن کی چشم سخن ہر بات میں ان کے قصوں پر اشارے کرتی جلاے۔ مگر اردو کے باغ نے فارسی و عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے۔ وہاں دیوی دیوتا

کا گزر نہیں۔ اور یہ سخت دشواری ہے کیونکہ اگر لکھنے میں کچھ تشریف کریں تو ترجمہ نہ رہا۔ اور اصل کی رعایت کی۔ تو کتاب معامے دقیق ہو گئی نہ کہ رفیق تفریح ۛ

حق یہ ہے کہ مجھ ناقابل کو ایسے موقع پر قلم اٹھانا ان مضامین کو فوج کرنا ہے۔ لیکن اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی۔ طوطے یا مینا کی زبانیں سنائیں۔ ترقی کریں نوچار فقیر رنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں۔ یا پریاں اڑائیں۔ دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنتوئیں۔ اب کچھ اور وقت ہے۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہئے۔ علوم فنون کے علاوہ بعضی مضامین بھی چاہئیں جو صاف شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہمارے بزم کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں۔ سب نظر آئیں۔ اور آب تاثیر سے دھوئے جائیں۔ تم دیکھتے ہو؟ بے جان مورتوں میں جان پڑنے کی ساعت آگئی ہے۔ قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جان بخشی کی تاثیر پیدا کرے۔ اس تقریر سے یہ غرض نہیں کہ زبان کے کپڑے اتار کر ننگا منکا کر دو۔ استعارہ اور تشبیہ کا نام نہ رہے۔ ہاں ایسے کپڑے چھناؤ کہ اصلی حسن کو روشن کر دیں۔ نہ کہ اندھیر چھھا جائے۔ کیونکہ اور زبانوں میں کیا ہے۔ جو ہماری زبان میں نہیں۔ ہاں طرزیان کا ایک ڈھب ہے۔ وہ تقریر میں آجانا چاہئے۔ فقط اتنی ہی کمی ہے ۛ

اے جاہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اردو کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں۔ اس لئے یہاں بھی در ماندہ ہوں۔ پھر بھی بوالہوسی دیکھو کہ شہسواروں کے ساتھ دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ جتنا نالائق ہوں اتنا ہی زیادہ شائق ہوں۔ دل سے لاچار ہوں کہ باوجود موانع مذکور کے جو نطفہ طبیعت کو بعض مضامین انگریزی سے حاصل ہوا۔ نہ چاہا کہ اپنے پیار سے اہل وطن کو اس میں شامل نہ کروں۔ جس قدر ہو سکے اور جس طرح ہو سکے۔ ایک پر توہ اردو میں دکھانا چاہئے۔ بالفرض

بُجھ سے بیان کا حق نہ ادا ہوگا۔ ایک رشتہ تو نکل آئیگا۔ زبان کے اہل ذوق بڑے بڑے صاحبِ قہر ت ہیں اور ہونگے۔ کوئی نہ کوئی منزل مقصود تک پہنچے گا۔ یہ چند مضمون جو لکھے ہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ ماں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اُسے لکھ دیا۔ اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔ اکثر نازک دماغ تو کہہ دیں گے۔ کہ وہاں بہت بہت کہیں گے۔ کوئی کہانی کہی ہے مگر مزاج نہیں۔ جو بڑے مبصر ہیں وہ کہیں گے کہ ہے مگر غور طلب ہے۔ بیشک یہ کہنا اُن کا اصلیت سے خالی نہیں کیونکہ خیالی تصویریں حکمت و اخلاق کی ہیں۔ فکر کے قلم نے خاک ڈالا ہے۔ اور استعارہ اور تشبیہ نے رنگ دیا ہے۔ طبیعتیں رشتہ سے آشنا نہیں۔ سبب یہ کہ ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں۔ خیر آزاد! نا اُمید نہ ہونا چاہئے۔

تمہاری سینہ نگاری کوئی تو دیکھیگا  
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے۔ کبھی تو دیکھیگا

## اُردو اور انگریزی انشا پر دازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچہ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں۔ وہی اُس سے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعہ فولادی تیار کر دے جو کسی تو پجانے سے نہ ٹوٹ سکے۔ اور چاہے تو ایک بات میں اسے خاک میں ملا دے۔ جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادو گر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے



رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دو نو صفتیں ہیں مگر ناقص ہیں اور اسکے سبب ظاہر ہیں ۛ  
 علمی مطالب اور کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے۔ اس کا سبب یہ ہے  
 کہ تم جانتے ہو۔ کل ڈیرہ سو برس تخمیناً اسکی ولادت کو ہوئے۔ اس کا نام اردو خود کہتا  
 ہے کہ میں علمی نہیں۔ بازار کی زبان ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے۔ لیکن دین کی باتوں کے لئے  
 کام میں آتی ہوں۔ سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج  
 نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک سچے شاہجاں کے گھر میں پیدا ہو۔ اور انگریزی  
 اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے تو انہوں نے  
 ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سو چند دیوانوں کے اس میں شری کتاب  
 تک نہ تھی۔ ان کی فرمائش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں تصنیف  
 ہوئیں۔ اور انہی کے ڈھب کی صورت و نحو بھی درست ہوئی۔ ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی  
 اردو ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۳۶ء میں ایک اردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۱ء سے  
 دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں۔ اور اردو نے  
 برائے نام زبان کا نفعہ اور سکھ پایا۔ اب خیال کرنا چاہئے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر  
 کل ۷۰-۷۲ برس کی ہو۔ اس کی بساط کیا؟ اور اس کے الفاظ کے ذخیرہ کی  
 کائنات کیا؟ پس اس وقت ہمیں اس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہئے ۛ  
 میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب سرمایہ  
 کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے با علم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے اور کس  
 ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ  
 بولیں۔ بالکل بے جا ہے ۛ

عربی زبان بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اس میں سارے لفظ تو عربی  
 نہیں۔ صد مارومی۔ صد ما یونانی۔ صد ما فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور زبان فارسی  
 کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج معلوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے۔ مگر اس میں

کبھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آ رہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہل  
 ملک میں علم آتا ہے پھر علمی اشیا کے لئے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں یا  
 وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں۔ علمی الفاظ کا ذخیرہ خدانے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحب  
 علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں۔ ویسے  
 ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اول خاتمہ عام میں علم پھیلتا  
 ہے۔ ساتھ ہی اُس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل کا اجزا اور اُس کے  
 کارخانہ کے صد ہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے  
 ہوئے تو اونے اونے ناخواندے سب جان گئے۔ اگر بے اسکے وہ الفاظ یہاں  
 ڈھونڈھتے یا پہلے یاد کر داتے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میک لینٹرن  
 اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اس کا یہی نام لیں خواہ فانوسِ جاودہ کہیں۔  
 خواہ اچھبھے کا تماشا کہیں۔ ہرگز کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن اگر وہ مشاہدہ میں علم ہو جائے۔  
 اور گھر گھر میں جاری ہو جائے۔ تو اُلٹے سے اُلٹا اُس کا نام رکھ دیں۔ وہی بچہ۔ بچہ  
 کی زبان پر مشہور ہو جائیگا۔ اور وہی سب سمجھنے لگے۔ انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً  
 ٹیلیگراف یا ایکٹریسیٹی وغیرہ وغیرہ۔ ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ  
 اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے۔ مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ  
 چیزیں عام ہیں۔ اس لئے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں کہ سب بے تکلف سمجھتے  
 ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے تو اس سبب سے ہے کہ وہ  
 بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی۔ اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب  
 اس کی تدبیر ہو سکتی ہے تو اہل ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود  
 علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے ملک میں پھیلاؤ۔ اور بھائی بندوں کو اُس سے  
 آگاہ کرو۔ جب اس میں سب قسم کے کاروبار ہونگے تو اُن کے الفاظ بھی ہونگے۔  
 ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا دغ مٹ جائیگا۔

تمہاری انشا پردازی پر جو نقص کا الزام ہے۔ وہ بھی کچھ درست ہے۔ اور کچھ قابلِ حشم پوشی کے ہے۔ یہ تو ابھی بیان ہوا کہ زبان مذکور علی زبان نہیں۔ سو برس ہوئے کہ ہندوستان کے رنگیں مزاجوں نے فقط اس حسب الوطنی سے کہ ہماری زبان بھی اور زبانوں کی طرح نظم سے خالی نہ ہو۔ اس میں اپنی وضع کاری اور نقش نگاری دکھانی شروع کی۔ اور حق یہ ہے کہ ۱۸۱۵ء ہجری تک جو کچھ زور اس نے پایا انہی کی بدولت پایا۔ انشا پردازی کا قاعدہ ہے کہ ابتدا میں جو مطالب کسی زبان میں ادا ہوتے ہیں تو ان میں سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب قریب کے استعارے خراج ہوتے ہیں۔ اسی واسطے جو مطالب اس میں ادا کئے جاتے ہیں وہ سُنتے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس پاس کے استعارے اور ان چیزوں کی تشبیہیں جو آنکھوں کے سامنے ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ وہ فقط مطلب مذکور کو سمجھاتے ہی نہیں بلکہ اپنی رنگینی اور لطافت سے اُس کے لطف کو روشن کر کے دکھاتے ہیں۔ اور چونکہ سادگی اور آسانی کے سبب سے انہیں سب سمجھتے ہیں۔ اس لئے سب کے دل اس کی تاثیر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چند روز کے بعد قریب قریب کی تشبیہیں اور استعارے تو خراج ہو جاتے ہیں اور آس پاس کی تشبیہیں عام تام ہو کر تمام ہو جاتی ہیں۔ نئی نسلیں و تہاں تشبیہوں اور استعاروں کو برتنا۔ چبائے ہوئے نوالے کا چبانا سمجھتی ہیں لیکن علم اور شوق جو مختلف رستوں سے آگاہ کر دیتے ہیں، اس لئے ان کے فکر کبھی دُائیں بائیں پھیلتے ہیں اور کبھی بلند ہونا شروع کرتے ہیں اور دور دور ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ فارسی اور اردو زبان میں جو کیفیت اس کی گزری ہے اس وقت میں اسی کا اشارہ کرتا ہوں کہ شعرا نے مستقل استعاروں سے بچنے کے لئے استعارہ اور استعارہ در استعارہ نکالا۔ اور اسے ایک ایجاد دلپذیر تصور کر کے نازک خیالی نام رکھا چونکہ دنیا میں ہر ایک نئی چیز بہت مزادیتی ہے۔ اس لئے اُوروں نے بھی اسے پسند کیا اور علم کی شکل پسندی

نے اسے زیادہ قوت دی۔ اور یہ معاملہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ نجان بلند خیالوں میں دنیا کے کاروبار مثلاً خط و کتابت یا تاریخی مقاصد یا علمی مطالب کا ادا کرنا تو بہت دشوار تھا۔ مگر ایک فرقہ پیدا ہوا جنہوں نے خیال بند کا خطاب حاصل کیا۔ انہی کی نشر میں سچر قلعہ۔ مینا بازار۔ چار غنصر وغیرہ اور نظم میں جلال اسیر۔ قاسم شہمدی۔ بیدل۔ ناصر علی اور ان کے تلمذوں کے دیوان موجود ہیں۔ چنانچہ دونوں کے امتیاز کے لئے دو شعر بھی اس مقام پر لکھنا ہوں۔ پہلے طریقہ میں ایک استاد کہتا ہے :-

سحر خورشید لرزاں بر سر کوئے تو مے آید
دل آئینہ را نازم کہ بر روئے تو مے آید

دیکھو ناصر علی سر شہدی اسی مضمون کو اپنی نازک خیالی کے زور سے الگ کرتے ہیں :-

نیار چشم بیدل تاب سن بے حجابش را	کہ باشد صافی آئینہ شبنم آفتابش را
----------------------------------	-----------------------------------

چونکہ اردو نظم نے فارسی کا دوہنی کر پرورش پائی تھی۔ اس لئے چند روز کے بعد یہی دقت اسے بھی پیش آئی۔ میر سوز۔ میر تقی۔ سودا۔ جرات وغیرہ کے زمانے تھے۔ ان میں اگرچہ مضامین شاعرانہ تھے مگر زبان میں ابنہ لائی خوبی موجود تھی۔ بعد ان کے وہی استعاروں کے اسیچ بیچ اور خیالوں کی معمولی ترقی شروع ہوئی۔ البتہ خیال آدھی ایسے رہے جو بزرگوں کی تقلید سے صفائی اور سادگی کی لکیر پر فقیر رہے۔ مثلاً قدام میں خواجہ میر درد کا شعر ہے :-

ترداسنی چہ شیخ ہمارسی نہ جائیو	دامن نخوردین تو فرشتے وضو کریں
--------------------------------	--------------------------------

مستأخرین میں غالب نازک خیال اس سے الگ ہو کر کہتے ہیں :-

دیلمے مسیحی تنکابی سے ہوا خشک	میر اسرداں بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
-------------------------------	-----------------------------------

بہر حال ہمیں شعرا کا ممنون ہونا چاہئے کہ جو کچھ لطافت یا زور ہماری زبان میں پیدا ہوا انہیں کی برکت سے ہوا۔ مگر وہ عاقبتاً نہ مضامین کے ادا کرنے کے سامان اور تغزل کے خوشماندہ از۔ اور اس کے الفاظ اور ترکیبوں کی دل آویز تراشیں تھیں۔ بھلا

خیالات فلسفہ کے سامان علوم کی اصطلاحیں مختلف مضامین تاریخی کے ادا کی طاقت - دلائل و براہین کے لڑانے کے زور اُس میں کہاں سے آئے۔ اگرچہ ابتدا میں جو کچھ تھا - یہ رنگ بہت خوشنما تھا - مگر اب دیکھنا ہوں تو زمانے کے انداز نے اُسے بھی پھیکا کر دیا ہے - اور تمہاری انشا پردازی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ غیر تو میں تو جو کچھ کہیں - بجا ہے - میں خود دیکھتا ہوں - اور شرمانا ہوں - کیونکہ مستقل چیز میں شگفتگی اور نازگی دکھانی بہت مشکل ہے - پھر بھی خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ ایک خزانہ مصوری کا تمہارے ہاتھ آ گیا ہے - مگر اتنا ہے کہ وہ انگریزی قفلوں میں بند ہے - جس کی کنجی انگریزی زبان ہے +

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ہم فارسی عربی کے الفاظ اُردو میں بولتے ہیں اسی طرح انگریزی الفاظ بولنے لگیں - یا ان کے محاوروں اور اصطلاحوں کے ترجمے اُردو میں استعمال کرنے لگیں - لیکن تم خیال کرو کہ عبارت و الفاظ حقیقت میں انسان کے خیالات اور مقاصد کے لباس ہیں - اور چونکہ طبعی خیال فرقہ ہائے انسان کے ہمیشہ قریب قریب ہوتے ہیں - اس لئے وہ جس ملک میں چلے ہیں رنگِ نلور دکھائیں - اسلیت میں کچھ نہ کچھ ملتے جلتے ہی ہونگے - بلکہ اُن میں بعض ڈھنگ ایسے ہونگے کہ ذرا رنگ پلٹ کر چاہینگے - تو دوسری طرف آجائینگے - اور نئی بہار دکھائینگے - چنانچہ جب بنظر غور دیکھینگے - تو معلوم ہوگا کہ دو قوموں کے ارتباط سے ہمیشہ ایک زبان دوسری زبان سے پر تو دلیتی رہی ہے - دیکھ لو - بھاشا پر جب فارسی عربی آکر گری تو اس کا کیا اثر ہوا - اور اب انگریزی کیا اندرونی اثر کر رہی ہے - فارسی اُردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہوگا کہ زمانہ یا زندگی کو عمر، واں یا آب گزراں کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھینٹی کو یا رسن عمر کو کاٹ رہا ہے - اور یہ بھی کہ مصرع

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصّے کے باب میں دیکھا ہوگا کہ اسے آتش غضب کہہ کر آگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہچو مار سیاہ بر خود ہیچید۔ اور کبھی جوش غضب کے لئے کہتے ہیں کہ آتش از چشمش پرید۔ دود از ندادش بر آمد۔ اور ہچو سپند از جا بر جت۔ پس انگیزی میں سٹھالیجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیسی یا دیوتا مقرر کیا ہے۔ اور انہی سامانوں سے سجایا ہے۔ جو ان کے لئے لازم اور شایاں ہیں۔ چنانچہ :-

### وقت

ایک پیر کہن سال کی تصویر ہے۔ اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پیر پر داز لگے ہیں کہ گویا ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں شیشہ ساعت ہے کہ جس سے اہل عالم کو اپنے گزرنے کا اندازہ دکھانا جاتا ہے۔ اور ایک میں درانتی ہے کہ لوگوں کی کشت امید یا رشتہ عمر کو کاٹنا جاتا ہے۔ یا ظالم خونریز ہے کہ اپنے گزرنے میں ذرا رحم نہیں کرتا۔ اس کے سر پر ایک چوٹی بھی رکھی ہے کہ جو دانا ہیں۔ اسے پکڑ کر قابو میں کر لیتے ہیں۔ لیکن آوروں کی چوٹیاں بیچھے ہوتی ہیں۔ اس کی چوٹی آگے رکھی ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو وقت گزر گیا۔ وہ قابو میں نہیں آسکتا۔ ماں جو پیش بین ہو۔ وہ پہلے ہی سے روک لے سو روک لے ۛ

### غصّہ

ایک عورت ہے۔ کالا رنگ۔ ڈراؤنی صورت۔ تمام بدن پر بال کھڑے ہیں جیسے لوہے کی سلاخیں۔ سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اٹھائے لہرا رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے خون برستا ہے ۛ  
بعض تصویروں میں اس کے دو پر ہیں کہ اڑانے لئے جاتے ہیں۔ اور اسکے ہاتھ میں شعلہ آتش ہے کہ دم بدم بھڑکتا چلا جاتا ہے اور ایک ہاتھ میں خونریزی کا

برچھا ہے ❖

## عشق

ایک موقع پر اسے نوجوان - خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے اور اپنے عالم میں اچھلنا کودتا ہے۔ مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے! اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا ❖

کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے۔ اور ماتھے میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر چوڑا ہوا ہے۔ کہ جدھر چاہتا ہے۔ مار بیٹھتا ہے۔ اس کی پناہ نہیں ❖

ایک موقع پر ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پہلو میں تیروں کا ترکش لگتا ہے۔ اور ماتھے سے تیر کا پیکان سان پر تیز کر رہا ہے ❖

یہ تصویر ایک ہیرو پر کھدی ہوئی ماتھے آئی تھی۔ خدا جانے کس عمد میں کھدی ہوگی۔ ار کہیا طلسم اس میں باندھا ہوگا ❖

## افواہ یا شہرت

اس کی تصویر دیکھی۔ ایک بڑھیا عورت ہے کہ اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان اُلٹی ہے۔ ساتھ ہی ساری زبانیں ساتیوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے۔ کہ جو بات اسکی زبان سے نکلتی ہے۔ وہی عالم میں ایک ایک کی زبان پر آتی ہے ❖

## حسن کی پرمی

سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔ شاید اس سے جوش و خروش کے ساتھ اس کی لطافت اور نزاکت کا بھی اشارہ ہو۔ وہ خود بھی محبت رکھتی ہے مگر لڑائی کے دیوتا پر عاشق ہے۔ جس کہ وہ نصیب ہو جائے۔ وہ اس کے پر تو جمال سے کامیاب ہو۔ پھولوں میں مہدی۔ گلاب۔ سیب۔ لالہ۔ نافرمان وغیرہ سے اس کی درگاہ میں نذر چڑھتی ہے۔ فاختہ۔ ہنس۔ ابابیل۔ ہڈہ

وغیرہ اُس کے تحت کو اڑاتے ہیں۔ خوشبوئیوں کی دھونی اور پھولوں کے  
 ہار اس کا مشہور چرٹھا ہے۔

انگریزی میں انہیں گاڈز کہتے ہیں۔ اور ہر ایک جذبہ انسانی بلکہ خزاں  
 اور بہار اور موسیقی وغیرہ وغیرہ کے لئے مختلف گاڈز تیار کئے ہیں۔ زمانے  
 کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا۔ اس لئے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی  
 ہیں ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیا کے لئے ایک ایک دیوی یا دیوتا ہیں۔  
 مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے۔ ان کی تصنیفات  
 میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں اور اس کے صنائع  
 و بدائع پر نظر کریں تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کون سا صنائع ہو گا جو ایسی دستکاری  
 کر سکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو۔ اور اسی نسبت سے تمام عالم موجودات اور  
 اُس کے جزئیات کو دیکھو۔ پھر جب دیکھتے ہیں کہ **الْوَالِدُ لَا يَصْدُرُ عَنْهُ  
 اِلَّا الْوَالِدُ** یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے تو  
 ضرور ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لئے ایک ایک رب النوع فرض  
 کیا جائے جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو۔ اور سب کا مالک رب الارباب  
 جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلہ کا ایک ایک  
 فرشتہ مومل مانا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے۔ ورنہ وہی وہی  
 یا دیوتا۔ وہی گاڈز۔ وہی رب النوع۔ وہی فرشتہ مومل۔ یہ خیال مدت سے  
 دل میں کھٹکتا تھا۔ چند روز ہوئے کہ شاہ ایران نے جو سفر نامہ یورپ کا آپ  
 لکھا ہے۔ وہ میری نظر سے گزرا۔ فرانس کے معنی آفرینوں نے ایک جگہ باغ رنگین  
 میں ایک نقلی پہاڑ بنایا ہے۔ اور اُس پر بہار کی گاڈس سجائی ہے۔ چنانچہ شاہ نے  
 وہاں پہنچ کر اُسے دیکھا ہے۔ اور اپنے بیان میں اسے رب النوع ہی لکھا ہے۔  
 غرض یہ ہے کہ خیالات کے اتفاقوں کو غور سے دیکھو کہ فقط طبیعت کی تاثیر

ہے۔ جس نے مختلف ملکوں میں مختلف طور پر طبیعتوں کے جوش ظاہر کئے ہیں مگر سب کا رشتہ کسی قدر قریب قریب ہو کر نکلا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب ایک جذبہ مہوم کو مجتہد فرض کرتے ہیں۔ اور اسکی صفات اور لوازمات کو آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں۔ تو اس پر طبیعت کی تاثیر پوری پوری قائم ہوتی ہے۔ اور جو خیالات اس پر نکلتے ہیں۔ ٹھیک درستی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور برجستہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں کہ یہی انشا پر دازی کا ایمان ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پہلے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے۔ تو ہمیں چاہئے۔ کہ انگریزی کے باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں۔ البتہ دونوں زبانوں میں ایسی مہارت ہونی چاہئے کہ یہ تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو سکے۔ جیسا کہ ابتدا میں ہماری اردو فارسی کے انشا پر داز کر گئے۔ اور پھر کہتا ہوں کہ یہ مطلب جب کبھی ہوگا۔ انگریزی دانوں سے ہوگا جو دونوں زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کی دو آنکھیں روشن ہیں۔ اردو اپنی زبان ہے اور انگریزی کبھی خدا نے دی۔ ہم اور ہمارے ساتھی پُرانی لکیروں کے فقیر۔ جو کچھ کرنا تھا سو کر چکے۔ نہ ان میدانوں میں اب ہم سے کچھ ہو سکے۔ چچاق کے دونوں جڑوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے۔ اُون اور شیشہ کو رگڑو۔ کہ ایلکٹریسیٹی کے فوائد حاصل ہوں۔ لیکن فقط پتھر ہو تو پتھر ہی ہے۔ اور فقط شیشہ۔ ڈر کا گھر۔ اپنی زبان کے زور سے اس میں اس طرح جان ڈالو کہ ہندوستانی کہیں۔ سودا اور میر کے زمانہ نے عمر دوبارہ پائی۔ اس پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کرو کہ انگریز کہیں۔ ہنار و نشان میں شیکسپیر کی رُوح نے ظہور کیا +

## آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا

سیر کرنے والے گلشنِ حال کے اور دورِ بین لگانے والے ماضی اور استقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانہ کے پہلا سن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا۔ اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا۔ تو تمام اولادِ آدمِ مسرتِ عام اور بفیکریِ مدام کے عالم میں بسر کرتے تھے۔ ملک ملک فراغ تھا اور خسرو آرام رحمدل فرشتہ مقام گویا ان کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا۔ نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اُس کی اطاعت اور فرمانبرداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی طرزِ ارب میں لگشت کرتے تھے۔ ہری ہری سبزہ کی کیاریوں میں لوٹتے تھے آبِ حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقتِ صبح کا اور سدا موسمِ بہار کا رہتا تھا +

نہ گرمی میں نہ خانے سجانے پڑتے نہ سردی میں آتشیانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں اسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چلتے چشموں پر لوگ جھلکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ وہ شربت سے سوا مزا اور دود سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی قوت ہانمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا۔ کہ سیدھے سادے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں رنگارنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آبِ دہوا قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ وہ ہزار متوی اور مفرح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوئیوں کے عطر مہک رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچہے۔ خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے۔ خوبصورت خوبصورت

چرند پرند اس پاس کھیل کرتے پھرتے تھے۔ با بجا درختوں کے چھڑٹ تھے۔ انہی کے سائے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لئے کمی نہ ہوتی تھی۔ اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں خوشی سے مالا مال اور دل فانیخ البال تھے ۛ

دیکھو اب انسان کی نیت میں فرق آتا ہے اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے

انفاقاً ایک میدان وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم ہمک گیا۔ مگر بوس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں۔ اور ہر ایک دل میں خود بخود یہ کشاکش پیدا ہوئی۔ کہ سامان عیش و آرام کا جو کچھ ہے میرے ہی کام آئے۔ اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اُس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آکر چالاکیاں دکھانے لگے۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا اُن کی ذریات یعنی غارت تماراج۔ لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور۔ خود پسندی۔ حسد نے اُس باغ میں آکر مقام کر دیا۔ اُن کے اثر سمیت سے لوگ بہت خراب ہوئے۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کے کارخانے نانیخ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے۔ یعنی عیش و افراور سامان فراوان جو کچھ درکار ہو۔ موجود تھا۔ اور اسی بے احتیاطی کو لوگ تو نگری کہتے تھے۔ پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو۔ اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو۔ لیکن تو نگری ہم بھی ہونگے۔ جب کہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اُس بیچارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو۔ مگر انہیں جب ہمارے خوشحال نظر آتے

تھے تو بھل جاتے تھے۔ اور اپنے تئیں محتاج خیال کرتے تھے ۚ

جان لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آئے وہاں احتیاج و افلاس نہ ہو تو کیا ہو

اس بدبختی کی سزا یہ ہوتی کہ احتیاج اور افلاس نے بزرگانہ لباس پہنا۔ اور ایک پیر زادے بن کر آئے۔ حضرت انسان کہ طبع خام کے خمیر تھے خسر و آرام کی عقیدت کو چھوڑ کر ان کی طرف رجوع ہوئے۔ چنانچہ سب ان کے مرید اور معتقد ہو گئے۔ اور ہر شخص اپنے تئیں حاجتمند ظاہر کر کے فخر کرنے لگا۔ مقام افسوس یہ ہے کہ اس بدبختی نفس قدم کے آنے سے ملک فراغ کا رنگ بالکل بدل گیا۔ یعنی انواع و اقسام کی حاجتوں نے لوگوں کو آن گھیرا۔ سال میں چار موسم ہو گئے۔ زمین بخر ہو گئی۔ میوے کم ہونے لگے۔ ساگ پات اور موٹی قسم کے نباتات پر گزران ٹھہری خزاں کے موسم میں کچھ برے بھلے اناج بھی پیدا ہونے لگے۔ لیکن جاڑے نے بالکل ناچار کر دیا۔ کبھی کبھی قحط سالی کا ٹڈی دل چڑھ آتا۔ اسی لشکر میں وبا اور امراض غول کے غول بیماریاں اپنے ساتھ لیکر آتے۔ اور تمام ملک میں پھیل جاتے۔ غرض عالم میں ایسا تلک پڑا کہ اگر ملک فراغ کے انتظام میں نئی اصلاح نہ کی جاتی۔ تو یک قلم برباد ہو جاتا۔ سب دکھ تو سہہ سکتے تھے۔ مگر قحط کی مصیبت غضب تھی۔ چونکہ یہ ساری نحوستیں احتیاج اور افلاس کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں۔ اس لئے سب اپنے کئے پر بہت پچھتائے ۚ

اب پچھانے سے کیا حاصل ہے۔ ان جنت کرو۔ اور محنت پر کرباں ہو

عالم کا رنگ بے رنگ دیکھ کر تندرہ پیر اور مشورہ دو تجربہ کار دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اور ایک سیب کے درخت میں جھولا ڈالے الگ باغ میں جھولا کرتے تھے۔ البتہ جو صاحب ضرورت ان کے پاس جاتا۔ اسے صلاح مناسب بتا دیا کرتے تھے۔ یہ سب بل کر ان کے پاس گئے کہ براے خدا کوئی ایسی راہ نکالے جس سے احتیاج و افلاس کی بلا سے بندگان خدا کو نجات ہو۔ وہ بہت خفا ہوئے

اور کہا کہ اپنے کئے کا علاج نہیں۔ خسرو آرام ایک فرشتہ سیرت بادشاہ تھا۔ تم نے اس کا حق شکر ادا نہ کیا۔ اور اس آفت کو اپنے ہاتھوں سر پر لیا۔ یہ افلاس ایسی بُری بلا ہے کہ انسان کو بیکس اور بے بس کر دیتی ہے مانگے مانگے کے سوا خود اس کا کچھ پیشہ نہیں۔ دیکھو اس نے ملک فراغ کو کیسا تباہ کر دیا۔ ہے کہ دلوں کے باغ ہرے بھرے ویران ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر یہ کہ ہم نے سنا ہے۔ احتیاج و افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام محنت پسند خردمند ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہے۔ کیونکہ اُس نے اُمید کا دُود پیا ہے۔ ہنرمندی نے اُسے پالا ہے۔ کمال کا شاگرد ہے۔ ہو سکے تو جا کر اُس کی خدمت کرو۔ اگرچہ اسی کا فرزند ہے لیکن اول تو سلطنت کا مقدمہ در بیان ہے۔ دوسرے ماں کے دود کا زور اُس کے بازوؤں میں ہے۔ استاد کی پھرتی اور چالاک طبیعت میں ہے۔ شاید کچھ کر گزریے۔ تدبیر اور مشورہ کا سب نے شکریہ ادا کیا۔ اور سیدھے محنت پسند خردمند کے سراغ پر آئے۔ دامن کوہ میں دیکھا کہ ایک جوان قوی سیکل کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا ہوا سے جھریا ہوا۔ دُھوپ سے تمتایا ہوا۔ شفقت کی ریاضت سے بدن اینٹھا ہوا۔ پسلیاں ابھری ہوئیں۔ ایک ہاتھ میں کچھ کھیتی کا سامان۔ ایک ہاتھ میں معاری کے اوزار لئے ٹائپ رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ایک بُرج کی عمارت کی بنیاد ڈالی ہے۔ سب نے جُھک کر سلام کیا۔ اور ساری داستان اپنی مصیبت کی سنائی۔ وہ انہیں دیکھتے ہی ہنسا اور ایک تہقیر مار کر پکارا کہ آؤ انسانو نادانو۔ آرام کے بندو۔ عیش کے پابندو۔ آؤ آؤ۔ آج سے تم ہمارے سپرد ہوئے۔ اب تمہاری خوشی کی اُمید اور بچاؤ کی راہ اگر ہے تو ہمارے ہاتھ ہے۔ خسرو آرام ایک کمزور۔ کام چور۔ بے ہمت۔ کم حوصلہ۔ بھولا بھالا۔ سب کے منہ کا نوالہ تھا۔ نہ تمہیں سنبھال سکا۔

۵۵ عمارت سے گویا وہی کاروبار میں انہی میں آئندہ یہ لوگ گزران کر کے اپنی قسمت کا کھٹا پورا کرینگے۔

نہ نصیبت سے نکال سکا۔ بیماری اور قحط سالی کا ایک ریلابھی نہ ٹال سکا۔ پہلے ہی  
 جلے میں نہیں چھوڑ دیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر مڑ کر نہ دیکھا۔ سلطنت کو ماتھ سے کھویا۔  
 اور تم کو انجھدھار میں ڈبویا۔ آج سے تم ہماری خدمت میں حاضر رہو۔ اور ہماری  
 آواز پر آیا کرو۔ ہم نہیں ایسی ایسی ندبیریں سکھائینگے کہ جس سے یہ شوریت زمین کی  
 دُور ہو جائیگی۔ ہو اکی شدت اعتدال پائیگی۔ گرمی سے سردی کی خوراک نکل آئیگی۔  
 ہم تمہارے لئے پانی سے مچھلی۔ ہو اسے پرندے۔ جنگل سے چرندے نکالینگے۔  
 زمین کا پیٹ چاک کر ڈالینگے اور پہاڑوں کی انتڑیاں تک نکالینگے۔ ایسے ایسے  
 دھات اور جواہرات دینگے۔ کہ تمہارے خزانوں کے لئے دولت ہو، ماتھوں میں  
 طاقت ہو۔ اور بدن کی حفاظت ہو۔ زبردست حیوانوں کے شکار کرو گے۔ اور  
 ان کے آزاروں سے محفوظ رہو گے۔ جنگل کے جنگل کاٹ ڈالو گے۔ پہاڑ کے پہاڑ  
 اکھاڑو گے۔ تم دیکھنا۔ بیس زمانہ کو وابستہ تدبیر اور تمام عالم کو اپنے ڈھب پر تسخیر  
 کرونگا۔ غرض ان باتوں سے سبکے دلوں کو بھالیا۔ وہ بھی سمجھے کہ تخت پسند خرد مند  
 بنی آدم کا خیر خواہ اور ہمارا دلی دوست ہے۔ ماتھ جوڑ جوڑ اسکے پاؤں پر گرے۔ ہمت  
 اور تحمل اس کے پہلو میں کھڑے تھے۔ اسی وقت انہیں جماعت مذکور پر انفر کر دیا۔

اے حضرت انسان! قدرتی گناہوں کی بہار تو دیکھ چکے۔ اب اپنی دستکاری کی گلکاری دیکھو

الغرض ہمت اور تحمل ان سب کو جنگلوں اور پہاڑوں میں لے گئے۔ کانوں کا  
 کھوونا۔ آتا چڑھاؤ کا ہوا کرنا تالابوں سے پانی بیچنا۔ دریاؤں کی دھاروں کا رخ  
 پھیرنا سب سکھایا۔ لوگوں کے دلوں پر اس کی بات کا ایسا اثر ہوا تھا کہ سب دفعۃً  
 کمزیر، باندھ آنکھیں بند کر دیک کی طرح رو سے زمین کو پیٹ گئے۔

عالم صورت چند روز میں رنگ نکال لایا۔ مگر نئے ڈھنگ سے یعنی سارنی پین  
 شہر، قصبوں اور گاؤں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ بیوؤں سے مالامال  
 ہو گئے۔ شہر و امیں بازار لگ گئے۔ عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ گھر آباد

ہو گئے۔ بدصبر دیکھو۔ ڈالیوں اور کلزاروں میں میوے دھرے۔ دسترخوان گھروں میں  
 بچے۔ ذخیرے غلوں سے بھرے۔ کیا گھر کیا باہر اس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔  
 غرض محنت پسند خردمند نے اس فرمانبردار رعیت کی بدولت یہ کامیابیاں اور  
 فتوحات نمایاں حاصل کر کے سلطان محنت پسند کا لقب حاصل کیا۔ اور جا بجا  
 ملک اور شہر قائم کر کے اپنی سلطنت جمائی \*

اے محنت کنو! محنت کی بھی ایک حد ہے۔ آخر ایسا تھکو گے کہ گر پڑو گے

سلطان محنت پسند۔ اپنے ملک میں ہمیشہ دورہ کرتا رہتا تھا۔ اتفاقاً اس کی  
 سواری ایک کوہستان میں گزری۔ وہاں میووں کی بنجات پانی کے چشے پیسے  
 آب حیات۔ ہرے ہرے سبزے۔ درختوں کے سائے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوئیں  
 خوبصورت خوبصورت جانور کھیل کر رہے تھے۔ یہ جگہ بہت بھائی۔ چاہا کہ کوئی دم  
 ٹھیرے اور دم لے۔ اتفاقاً وہاں ایسی ایک قوم سے سامنا ہو گیا جن کی کثرت  
 و انبوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ مگر سب کے سب ضعف و ناطافتی سے زمین میں پچھے  
 جاتے تھے۔ ان میں ٹھکن اور سستی کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اور ناتوانی ان پر مدار  
 تھی صورت اس کی کہ آنکھیں میٹھی ہوئی۔ چہرہ مڑھایا ہوا۔ رنگ زرد مینہ پر بھجریاں  
 پڑی۔ کہ ٹھکی۔ گوشت بدن کا نشاک۔ ہڈیاں نکلی ہوئی۔ غصہ دیکھا کہ سب ایشیتے کا پیتے۔  
 روتے بورتے۔ آہ آہ کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی آوازیں ہی سن سن کر لوگوں کے  
 دل مردہ اور جی افسردہ ہوئے جاتے تھے \*

تخل اور ہمت کو جو بھی ان کی صورت نظر آئی۔ دفعۃً غش کھا کر گر پڑے۔ اس  
 جنگل کی ہوا میں عجب تاثیر تھی کہ بھلے چنگے آدمیوں کے جی چھوٹے جاتے تھے۔  
 اور جو صلے پست ہوئے جاتے تھے۔ سب کے ہتیار اور اوزار ہاتھوں سے چھٹ  
 پڑے۔ بہتیرا دون کو سنبھالنے تھے۔ مگر دل قابو میں نہ آتے تھے۔ اس حال کو دیکھ کر  
 سب کی عقل جاتی رہی۔ اور پھر نئے سرے سے اپنے حال پر افسوس کر نہ لگے۔ کہ

ہائے ملک فراغ ہو، کیوں چھوڑا۔ اور خسرو آرام کی اطاعت سے کیوں منہ موڑا۔ آپس میں صلح کی۔ کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ آخر سلامت یہ پھیری کہ چاند پھر اپنے قدیمی بادشاہ خسرو آرام کی خدمت میں چل کر سلام کرے۔ اور باقی زندگی جس طرح ہو۔ اس کی اطاعت میں بسر کر دو +

جو آتش کے قدرتی سامان ہے وہ اپنے ہاتھوں کو لے لے۔

اب محنت کے بنانے ہوئے سامانوں سے آرام چاہئے ہو۔ ہرگز نہ ہوگا۔

خسرو آرام بھی دنیا کے پردہ پرست اٹھ نہ گیا تھا۔ ایک پل میں اس کے پاس جا پہنچے۔ غرض نصیر میں غرض کیا کہ جو کچھ ہم نے محنت کی مدد سے حاصل کیا ہے وہ سب نذر ہے۔ ہمیں حضور اطاعت میں قبول فرمائیں۔ یہاں خسرو آرام نے بھی اب دربار کا آئین کچھ اور کر دیا تھا۔ تکلف۔ آرایش۔ بناؤ شکار۔ عیش۔ آرام بہت سے لوگ رکن دربار ہو گئے تھے۔ قدرتی سبزہ زار اور زندانی مرغزاروں کو چھوڑ کر غلوں میں جا بیٹھا تھا۔ بالاخانوں اور ذیو خانوں میں رہتا تھا۔ خانہ باغوں کی روشوں پر نگاشت کرتا تھا۔ بازاروں میں نرم نرم بہتر اور گرم گرم مکانوں میں سوتا تھا۔ گرمیوں میں تکلف کے تہ خانوں میں بیٹھتا۔ اور بناؤٹا کے قوارے سامنے چھننا کرتے۔ باوجود اس کے کوئی نعمت مزانہ دیتی تھی۔ اور کوئی غذا لنگ نہ لگتی تھی۔ سب کچھ موجود تھا۔ مگر ناروا خواہ خوشی ایک بات سے بھی مائل نہ ہوتی تھی۔ غرض ملک فراغ میں جو اس کے انتظام اور آزادی کا لطف تھا۔ وہ نہ رہا تھا کیونکہ سلطان محنت پسند کے زیر حکم رہ کر لوگ خالی بیٹھنے سے بھی گھبراتے تھے۔ اور جسے خوشحالی اور فراغ البالی کہتے ہیں۔ وہ کسی طرح نہ مائل ہوتی تھی +

آرام کے بندو! دیکھو۔ بہت آرام بہت ہی نوابیاں پیدا کرتا ہے۔

آرام شاہ کے وزیر اعظم عیش اور نشاط نام دو شخص ہوئے تھے۔ مگر عیش نے دعا کی۔ کیونکہ مرض ایک بڑا غنیم سلطنت کا تھا۔ وہ مدت سے ملک آرام کے درپے تھا۔ چنانچہ مرض نے عیش سے سازش کی۔ اور ایک رات یکایک قلعت جسم پر کند

تم کو۔ اسی وقت جلاوطن کر دوں۔ چنانچہ مشورہ وغیرہ مشیروں کی صلاح سے راحت تکلف۔ بناؤ۔ سنگار وغیرہ سب نکالے گئے۔ ایک دن رسم شادی کہ وہ بھی سیدھی سادی تھی سہرا انجام ہو گئی۔ اور دونو سرکاروں کا انتظام ایک ہو گیا ہے جب آرام اور محنت دونو اعتدال سے ہوں۔ تو کیوں صحت حاصل نہ ہو

باتفاق کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ چند روز کے بعد خسرو آرام کے ماں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام صحت شاہ رکھا گیا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ دونو طرف رسوم مبارکبادی کی ادا ہوئیں۔ گنہگار ان سلطنت یعنی نشاط اور عیش کی خطائیں بھی اس خدا داد خوشی کے شکرانہ میں معاف ہوئیں۔ مگر اس شرط پر کہ بے طلب سامنے نہ آنے پائیں۔ نہ بے تقریب بلائے جائیں۔ بغرض صحت شہزادہ بی بی سلامت خاتون کا دود پیتا تھا۔ خواجہ پرمہیر اُسے پرورش کرتے تھے۔ انہی کی تعلیم و تربیت میں بڑا ہوا۔ چونکہ دو گھروں میں ایک چراغ تھا۔ خسرو آرام اور سلطان محنت پسند دونو آنکھوں کا نور سمجھتے تھے۔ صحت شہزادہ بھی دونو بزرگوں کی برابر اطاعت اور دونو سلطنتوں کی برابر رعایت رکھتا تھا۔ اتفاق کی برکت سے خدا نے دونو گھر روشن اور سلطنت آباد کی۔ اور خدا کے بندوں کو بھی آٹے دن کی مصیبتوں سے نجات دی ہے

## سچ اور جھوٹ کا رزنامہ

عہد قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں۔ کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ شہسواری۔ تیراندازی اور راست بازی۔ شہسواری اور تیراندازی تو بے شک سہل آجاتی ہوگی۔ مگر کیا اچھی بات ہوتی۔ اگر ہمیں معلوم ہو جانا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے

سکھاتے تھے۔ اور وہ کونسی سپرنٹی۔ کہ جب دروغ دیو زادو اگر ان کے دلوں پر شیشہ جا دو مارتا تھا۔ تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے ۛ

اس میں شک نہیں کہ دنیا بڑی جگہ ہے! چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشقت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لئے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہو جاتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے۔ ناچار مگر نا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے۔ جب لقمہ رزق کا پانا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکروہ و غانا کی چاٹ لگاتی ہے۔ اور جزوی جزوی خطا میں ہو جاتی ہیں۔ جن سے مکتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہونگے۔ جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے رستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں ۛ

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لئے سننے، اے بھی ضرور ہیں۔ کیونکہ خوشامد جس کی دوکان میں آج موتی برس رہے ہیں۔ اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہوگا۔ اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈرکا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تا بعد ارمید کا بھوکا آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست محبت کا بندہ ہے۔ اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں نہ ڈرپوک ہیں۔ انہیں باتوں باتوں میں خوش کر دینے ہی کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نوڈے گدہوں کے دعوے بل ڈاگٹ کی آواز سے کسی میدان آگے نکل جاتے ہیں۔ تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں کچھ اُمید۔ کچھ ڈر۔ کچھ مروت سے۔ غرض چاروں ناچار کبھی ان کے ساتھ راتھ۔ کبھی کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے ۛ

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عملداری دُور دُور تک پھیل گئی ہے بلکہ

لے ایک تمہ کا باری کتا ہے۔ جسے ہندوستانی زبان میں کھانا تک کہتے ہیں ۛ

جن صاحب تینروں کو قوتِ عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی۔ اور خود اس مردار کے  
 متنفر ہیں۔ وہ بھی اسی کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔  
 سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے مگر پھر بھی لوگ اسے ہر وقت اچھا  
 نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شے پر دل آتا ہے اور سچ اس کے برنلائٹ ہوتا  
 ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی بُرا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت  
 انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا  
 اُس کا جاننا بھی نہیں چاہتے۔ جو بات پسند نہیں آتی۔ اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔  
 اس کاں سنتے ہیں۔ اُس کاں سے نکال دیتے ہیں۔

نیکبوں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں۔ اور  
 جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ اسی طرح انواع و اقسام  
 کے رنگوں پر اس کفایتیں کی ہیں۔ تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔  
 واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی۔ جو کہ ملکہ  
 دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوف نے ہوش سنبھالا تو  
 اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انہوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق  
 ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے  
 ساتھ خوبیوں اور محبوبوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے  
 تعریف کی۔ عزت و اہم کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا۔ اور حکم ہوا کہ جاؤ اولادِ آدم  
 میں اپنا نور پھیلاؤ۔ عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفند نابکار تھا کہ حمق  
 تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے  
 دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں مستخر اور ظرافت  
 کے بھانڈا آیا کرتے تھے۔ تو ان کی نگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً اس دن وہ  
 بھی آیا ہوا تھا اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوسِ فاخر کا خلعت

مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چلتے نکلا۔ اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔ جب یہ دو دعویٰ دائر ہوئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے۔ تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی۔ سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سیح کے زور و طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے۔ اُٹھی۔ اور اپنے زور میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اسی واسطے بلند اُٹھی۔ اکیلی آئی۔ اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اڑاتے آتے تھے۔ اور پیچھے پیچھے ادراک پر سی پر داز تھا مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے۔ شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی۔ اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑے تھا۔ اور جو قدم اٹھتا تھا۔ دس قدم آگے پڑتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیافرشتہ سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا ❖

دروغ دیو زاد بہر وہاں بدلتے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سانگ بھرتا تھا۔ تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لئے تھیں۔ اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا۔ اسی لالچ کا مارا کمزور تا بعد اوروں کی طرح ان کے حکم اٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں اس کی بے معنی تھیں۔ اور کام بھی الٹ پلٹ بے اوسان تھے کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا۔ اپنی شجہہ بازی اور نیزنگ سازی سے فحشیاب تو جلد ہو جاتا تھا۔ مگر ٹھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اس کے یار وفادار تھے۔ اور اگر کچھ تھے تو وہی سنبھالے رہتے تھے ❖

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمناسامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی۔ اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لئے سر پر بادل کا دھواں دھار پکڑ لپیٹ لینا تھا۔ لاف دگراف کو حکم دینا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دینا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی تلوار۔ بائیں میں بے جیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نمائیروں کا ترکش آویزاں ہونا تھا۔ ہمواد ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی تیج چھپے سے زور لگاتے تھے۔ غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا۔ اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دُور دُور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا۔ مگر وہ بھی باد ہوائی۔ اٹکل پچھو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا۔ دمدم جگہ بدلتا تھا۔ کیونکہ حق کی کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تیاڑ جانا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑاک بجلی کی تلوار نہ تھی۔ مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خدا داد کا خود سر پر دھرتا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتحیاب ہوتی تھی تو یہ شکست نصیب پانے تیروں کا ترکش پھینک بیجیائی کی ڈھال سُنہ پرلے ہمواد ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا۔ اور لوگ پھر برا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھرتے تھے۔ اور وہ جھوٹا ناکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے رُٹتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کو دا۔

دروغ دیوزاد نے تھے رُٹے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں۔ اس لئے دھوکہ بازی اور

شبہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لئے ایک شرک تیار کرو مگر اس طرح کے ایچ پیج اور ہیر پھیر دے کر بناؤ۔ کہ شاہراہ صداقت جو خط مستقیم میں ہے اُس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اُس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا تو اُسی رستے سے جدھر چاہتا تھا نکل جاتا تھا۔ اور جدھر سے چاہتا تھا۔ پھر ان موجود ہوتا تھا +

ان رستوں سے اُس نے ساری دُنیا پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں فتح پاتا تھا۔ ہواد ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرمانروائی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا۔ تو بڑی گھاتوں سے مقابلے کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی ایک لمبی زنجیر بنائی تھی۔ سب اپنی کمزریں اس میں جکڑ لیتے تھے۔ کہ ہرگز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑینگے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا۔ ادھر باغی ہو گئے۔ ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات سُنینگے اُسے مانینگے۔ اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر منتقل ہو جائیگی مگر یہاں دیکھا کہ گزارہ بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں۔ اور ہواد ہوس کے غلام ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی۔ مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف سے آئی اور پھر بد عملی ہو گئی۔ کیونکہ ہواد ہوس جھٹ بناوت کا نقارہ بجا دشمن کے زیرِ علم جا موجود ہوتے تھے۔ ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں

لے جب جھوٹ کی قلعی کھلنے لگتی ہے تو جھوٹا آدمی ایسی باتیں پیش کرتا ہے جس سے لوگ شبہ اور شک میں پڑ جائیں اور سمجھیں کہ ہوتو سکتا ہے۔ شاید جو یہ کتاب ہے وہی سچ ہو +

سے کچھ دہتی نہ تھی کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا۔ مگر جب بار بار ایسے پاجی کینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی۔ اور اُس میں سوائے مکرو فریب اور کمزوری و سبے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی تو گھسٹی تھی۔ اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے نا اُمید ہوئی تو غصہ ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ مجھے آپ اپنے پاس بلا لیجئے۔ دُنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں۔ انہی میں رہا کریں۔ اپنے کٹے کی سزا آپ پالینگے۔ سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا۔ مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سیج کا قدم دُنیا سے اٹھا تو جہان اندھیر اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائیگا۔ چنانچہ اس خیال سے اُس کی عرض نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بد اصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اُسی وقت عالم بالا کے پاک تمادوں کو جمع کر کے ایک انجن منقذ کی۔ اُس میں دو اہم نتائج طلب قرار پائے :-

- (۱) کیا سب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرمانروائی دنیا میں ہر ذلغز نہیں؟
- (۲) کیا تہ بیر ہے۔ جس سے اُس کے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں سائی ہو۔ اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو؟

کیٹی میں یہ بات کھلی کہ درحقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے۔ اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعوؤں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے۔ جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اٹھ کھڑے

ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دورانِ نشی اور صلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اُسے چاہئے کہ جس طرح ہو سکے اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہوگا۔ لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے۔ کیونکہ دیودروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے برخلاف ہے۔ اول تو اس میں فرغ البالی بہت ہے اور جو لوگ اسکی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انہیں سوا سے عیش و آرام کے دُنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہرہ و پیہ ہے۔ جو صورت سب کو بھانٹے۔ وہی روپ بھر لیتا ہے۔ اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہننے رہتا ہے۔ غرض اہل انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کا طرز لباس بدلنے کی تجویز کی۔ چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا۔ اور وہ پہن کر لوگوں کو نفل دیا کرتا تھا۔ اُس جامہ کا مصالحت زمانہ نام ہوا۔ چنانچہ اس نعلت کو زریب بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی۔ اور آگے کو رتنہ مانگتی ہوا دیتوں ہاکم وہاں کے اُسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی گنجیاں نظر گذارنتے۔ ادھر اس کا دخل ہوا ادھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامے کے اترتے ہی اُس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن جمال پھر چمک کر نکل آیا۔ چنانچہ اب یہی وقت آ گیا ہے یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیزی کر کے پھیلانا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لئے نمٹ نہ سہجھنے لگتے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ کر لانا ہے۔ جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے۔ تو وہ نفاذ اُتار کر بھینک دیتا ہے۔ پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے۔

کر جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے ۛ

## گلشنِ اُمید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع و اقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں۔ مگر یہ زمین جس قدر تجھ اُمید کو پرورش کرتی ہے۔ اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اُوپر کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کراٹھتی ہیں۔ یا بے نقصاً سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر اُمید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تیز ہونے لگی کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوشحال یا بد حال بھی ہو سکتی ہے۔ اسی وقت سے اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ اُمید ایک رفیقِ ہمد ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے۔ دہمدم دلوں کو بڑھا آتا ہے اور سینہ کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوشحالی کا باغِ پیشِ نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدائی کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں۔ پھر بھی یہ جاو نکار مصوٰر ایک نہ ایک ایسی تصور سامنے کھینچ دیتا ہے۔ جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائیگی تو ساری ہوئیں پوری ہو جائیں گی اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائیگا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی۔ بیماری۔ قید۔ مسافرت بہت سے دُنیا کے دکھ درد ہیں کہ اُمید نہ ہو۔ تو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا پھٹے نرا سامرے۔ یہ نعمت جو بظاہر ہرگز نہ دیکھیں میں عام ہو رہی ہے۔ وہ ضروری شے ہے کہ دُنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے ہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے۔ تو ایک دم

گزارنا مشکل ہو جائے۔ اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے

پر امید و وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار

اس میں بھی شک نہیں کہ اُمید دھوکے بہت دیتی ہے۔ اور ان باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ مگر وہ دھوکے، سلی نعمتوں سے سوا مزادیتے ہیں۔ اور موبوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دونوں سے گران بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ناکام بھی کرتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اُس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے۔ میں ایک رات انہی خیالات میں حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے اپنے تئیں آپ دھوکے دیتا ہے اور زمانہ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لئے اُمید و بیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے۔ یکا یک آنکھ لگ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغِ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ اُمید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ اس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ تمام عالم رنگین، شاداب ہے۔ ہر چین رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا۔ خوشبو سے مہکتا ہوا ہے۔ لکنا نظر آتا ہے۔ زمین فصلِ بہار کی طرح گلہاے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے۔ اور رنگارنگ کے جانور درختوں پر چھپے بھر رہے ہیں۔ یہ سما بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ مرتنا پا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمنہاے دلکش کو نظر غور سے دیکھنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو ٹشگتگی اور تفریح کا لطفت زیادہ ہو۔ پھر دیکھا کہ نفوڑی ہی دُور آگے رنگیلے چکیلے پھول کھلے ہیں۔ آبِ زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلجھل کر رہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھماتے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز

لے دیکھ کر تڑپیں ہوں جو نساں گریابِ ہنست، اُس سے آگے کی گلیا ہوں کی ہوں لہں پیدا ہوتی جاتی ہے

سے بولتے سنانی دیتے تھے۔ یہاں خوب زور شور سے چمکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہکاتے ہیں۔ اور پھول اپنی خوشبو سے منک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اٹھائی تو اور ہی طلسمات نظر آیا۔ یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں۔ ان کے تیار سیوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف تے اور گے بڑھنے کو لچپایا۔ چنانچہ قدم اٹھایا مگر جوں جوں آگے بڑھنا گیا۔ زیادہ حیران ہوتا گیا۔ کیونکہ جو ہریا ول سامنے سے لہمائی دکھائی دیتی تھی۔ پاس پہنچ کر اس کی رنگت پیکسی پڑ گئی۔ اور سیوے تو گر ہی چکے تھے۔ پلبیس جو چھپے بھری تھیں۔ وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا۔ اور جو ہاریں تھیں۔ وہ بھی ہر قدم پر سامنے ہی تھیں۔ مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں۔ گویا میرے شوق آرزو کو دھکا تھی۔ کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا۔ وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں +

اگرچہ بار بار خوش اور دم مہم نکلے جوتے ہوتے میں دق ہو گیا تھا۔ مگر دل کے کان میں کوئی ہی کہے جانا تھا کہ چلے چلو۔ جو نہیں ڈبکا رہی ہیں۔ کبھی نہ کبھی ہاتھ پوجی آئیگی۔ آخر چلتے پلٹے ایک جگہ نظر آیا کہ جس میں زن و مرد خرد و کایاں بہت سے آدمی اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس میلے میں جاتے ہیں۔ یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کے منہ پر یقین کارنگ چمک رہا تھا۔ اور ایک ایک کی آنکھ سر نہ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ خاص قسم کی ہے کہ وہ اسی کے دل میں ہے۔ سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے۔ مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا۔ نہ اپنے فکر کارانہ دوسرے کو جانا گوارا کرتا تھا۔ بہت لوگوں

۱۔ انسان کی طبیعت کا عجیب سا ہے۔ جو ہوس پوری برجاتی ہے وہ مزا نہیں ہتی۔ اس سے آگے کے لطف دل میں ارمان اور ذوق شوق پیدا کرتے ہیں +  
 ۲۔ جوں جوں جھومر مراد میں دیر لگتی ہے۔ شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور امید بھی اس کے ملنے کے ساتھ سامنے دکھائی جاتی ہے +  
 ۳۔ انسان میں مقدر کھٹے گوشش کرتا ہے کسی سے کب کھتا ہے۔ اندر ہی اندر تیرپ کرتا ہے +

کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزو مند شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو۔ تو انہیں اس کے بچانے کی بھی فرصت نہیں۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا۔ اور ٹھوڑی دیر تک غور سے دیکھا گیا۔ آخر ایک بڑھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انہی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارنا تھا مگر کچھ ہونہ سکتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ بڑھے کو اب کیا ہوس ہوگی۔ اسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اسے سلام کیا۔ بڑھے نے تیور سی میل کر منہ پھیر لیا اور کہا ”صاحبِ دق نہ کیجئے۔ آپ جانتے ہی ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ نام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائیگا۔ افلاس زدہ اور طالبِ روزگار بیچارے۔ ٹیکس اور محصولوں کے مارے آنے دن کی جانکنی سے خلاص ہو جائیں گے۔ بلکہ فلک کے سپرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سرگرداں ہیں۔ وہ بھی بازو ڈال کر آرام سے بیٹھ جائیں گے۔ میں نے بڑھے کو اس کی خفیہ دماغ کے دوائے کیا۔ اور وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص ماننے آیا۔ جس کی ملائمت شکل اور آہستگی رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید یہ کچھ انطلاق سے پیش آنے۔ مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے جھٹک کر ایک سلام کیا۔ اور کہا ”اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا۔ مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں۔ کیونکہ ۲۰ برس سے میں ایک عہدے کی امید واری کر رہا تھا۔ اب وہ فالی ہو چکا ہے۔ میں نے اسے بھی چھوڑا۔ اور ایک اور کو جالیا۔ وہ گھبرا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے۔ کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے بچھنے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا جھکا چلا آتا تھا۔ اس نے ایک فوط خوری کی کل لیا اور کھنی۔ اس کے دریاے منافع میں فوط مارا چاہتا تھا یعنی اگر کچھ اور نہ ہو۔ تو ایجاد کا انعام

لے لینے کا۔ آگے ہی آکر اسے احتیاج کی کون پوچھا۔ اگر آپ لے لیں تو میں کو ہونوں سے زیادہ ہوں۔

ہی ماتھے آجائے۔ ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دور چلتا ہے اور ٹھیکر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے۔ اور سرکارِ علم سے انعام کا امیدوار ہے۔ جب جا بجائے مگر یہ کھائیں تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے۔ اب جو اپنی آنکھ کے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو۔ اور آپ دیکھو۔ کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین بے پروا سا نظر آیا۔ وہ آزادی کے عالم میں سکڑا تاج لانا ہے۔ اُسے دیکھ کر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہئے چنانچہ معمولی سوال کا سبق اُسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا صاحب جہاں آپ کھڑے ہیں یہ ملکہ امید کا باغ ہے۔ وہ ملکہ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو۔ بہت سی پریاں خوشنما اور نفسِ نفیس چیزیں لئے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا۔ انہی کے اشاروں پر لپچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھو تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوانِ عالی شان ہے اور اُس کے صدر میں ایک پری جس کا گلزار جوانی عین بہار پر ہے۔ سر تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اُس کے زیر لب پارہ کی طرح لوثتی ہے۔ لعل و جواہر تاج مرتع موتیوں کے ہار خلعت زنگار کشتیوں میں چھنے ہوئے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے۔ اُس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں۔ اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیشِ مادام اور فرحتِ دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اُس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاؤٹ۔ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے۔ اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے پھولا نہیں ساتا۔ رستے کے دو نو طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی مگر ہر سے درختوں نے سایہ کیا ہوا۔ دیواریں لپی ہوئیں۔ دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا۔

”قناعت کا آرام گھر“ بعضے تکے ماندے ان میں چلے جاتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھتے

رستے والے دیکھ دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور بہت کے میدان مار گئے ۶

باغ اُتید کے دو دروازے

یہ دیکھ کر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی۔ اور اس جگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ باغ اُتید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں۔ ایک داروغہ دانش کے اختیار میں ہے۔ دوسرا داروغہ خیال کے تحت میں ہے۔ داروغہ دانش ایک تند مزاج اور وسواسی شخص ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور اٹلی بریھی تھیں نہیں کر لیتا۔ تب تک تفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا مگر داروغہ خیال خلق اور ہلنار شخص ہے۔ وہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا ہے بلکہ جو اس کی حد میں جائے اُس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ داروغہ دانش کی جوتوں سے گھبراتے تھے یا جنہیں اُس نے جلنے نہیں دیا تھا۔ ان لوگوں کی بھیڑ اُس کے دروازے پر لگ ہی تھی۔ داروغہ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تختگاہ خاص کو رسنہ جانا تھا مگر اس راہ کی زمین بھلسنی۔ ٹرک پتھر ملی۔ رستے ایسے اچھ پیچ کے تھے کہ گھٹن گھاتی اسی کو کہتے ہیں۔ جب کسی قسمت والے کو داروغہ سے اجازت مل جاتی تھی۔ تو اس گھٹن گھاتی میں دکھ بھرنے پڑتے تھے۔ اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اچھ پیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے۔ اور جو جو بچاؤ کے مقام تھے ان میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے۔ مگر پھر بھی اکثر ایسی شکلیں پیش آتی تھیں۔ جن کا سان گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے وہاں کچھ ایسا نملکہ پیش آتا تھا کہ یکا یک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں اُجھاو میں اُجھتے

۱۵۔ باتیں ہم پر رد گزرتی ہیں۔ مگر کوئی خیال نہیں کرتا۔ دیکھو! یہاں نہیں کس خوبصورتی سے رنگ دیکر بیان کیا ہے۔ عقل جب تک سب تدبیروں اور تجویزوں کے پورے پورے بندوبست نہیں کر لیتی تب تک کسی اُتید پر کوشش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہم و گمان کے بندے ذرا سا سہارا دیکھتے ہیں۔ اور اُٹھ دوڑتے ہیں۔ وہی ٹکراتے ہیں۔ اور ناکام ہوتے ہیں ۶

تھے۔ صد بار پٹنوں میں رہتے تھے۔ بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے۔ اکثر  
 خس پوش گرہوں میں جا پڑتے تھے۔ غرض ایسی ایسی خطرناک دارو تیں اور  
 ناکامی کے صدمے تھے کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں اٹے پھرتے تھے۔  
 بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے۔ بعض بعض ایسے بھی تھے کہ ان کی  
 استقلال سے راہ تھی۔ وہ اس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے  
 تھے۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلہ کو دیکھ کر بچھتاتے تھے۔ کہ ہاے ہماری  
 محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی۔ یہ تو کامیابی نہیں ہوئی۔ حق تلفی ہوئی ہے۔  
 باقی جو لوگ اخیر انعام لیکر پھرتے تھے۔ ان کا انجام یہ ہوتا تھا۔ کہ دانائی داروغہ  
 دانش کی بی بی۔ ملکہ کی مصاحب تھی۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑتی تھی۔ اس کی رہنمائی  
 سے وہ لوگ گوشہ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔

اے راہ امید کے مسافر! چونکہ داروغہ دانش کی جتیں اور ان کے رستہ کی  
 مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں اس لئے میں نے داروغہ خیالی کی طرف  
 رخ کیا۔ یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی مگر ملکہ صاف سامنے  
 کھڑی تھی۔ وہ یہاں سے سرتاپا ساری نظر آتی تھی۔ اور اپنے عجائب غرائب۔ نایاب  
 اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر جن طلب کے انداز دکھاتی تھی۔ پھر بھی لطف  
 یہ تھا کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جدا جدا انداز سے اڑا رہی تھی جس سے ہر شخص  
 یہ جانتا تھا۔ کہ جو نگاہ مجھ پر ہے وہ کسی پر نہیں۔ اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی  
 کی امید نہیں۔ اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا۔ پھر اس خیالی  
 رستے کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم نہ ٹھیکر سکتا تھا۔ کیونکہ وہی باتوں  
 میں پائداری کہاں؟ باوجود اس کے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے  
 تھے۔ کیونکہ اس رستہ میں چلنے والے بہت ہیں۔ اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے  
 ایسی چھائی ہوئی تھی۔ کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا تھا۔ ساتھ اس کے ہر شخص

یہ جانتا تھا کہ جو رشتہ میں نے پایا ہے۔ وہ کسی کو ہاتھ ہی نہیں آیا۔  
 یہ بلا نصیب لوگ ہتیرے بتن کر رہے تھے۔ بعض تو ایسے کلدار پر لگانے  
 کی فکر میں تھے جن کی حرکت کبھی تھکتے ہی نہیں۔ بعض کہتے تھے ”جو ہو سو ہو۔ انہی  
 قدموں چلے جاؤ بلا سے مر جاؤ۔“ یہ سب حکمتیں کرتے تھے۔ اس پر بھی زمین سے  
 اٹھ نہیں سکتے تھے۔ اور اُٹھے تو وہیں گر پڑے۔ مگر یہاں پڑے تھے۔ تاک اُدھر  
 ہی لگی تھی۔ اور اس حال تباہ پر خود پسندی کا یہ عالم تھا۔ کہ جو لوگ سامنے عقل کی  
 کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ان پر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیال کے پیارے۔ اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے۔ جنہوں نے  
 اس باغ میں آکر اُوروں کی طرح چڑھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تھا۔ یوں ہی ایک جگہ پڑے  
 تھے۔ یہ مقام۔ کابل گھائی کہلاتا تھا اور ایک سُن سان اور بے آزار موقع پر تھا۔  
 مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی۔ یہ اسی یقین میں خوش پڑے تھے۔ کہ کوئی  
 دم میں وہ خود یہاں آیا جا ہتی ہیں۔ اگرچہ اور لوگ ان وہمیوں کو احمق اور کابل  
 وجود سمجھتے تھے۔ مگر انہیں کچھ پروا بھی نہ تھی۔ بلکہ یہ غم غلط لوگ اسی دعوے میں  
 خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظر عنایت ہوگی۔

انہی بے پرواؤں میں میں بھی پڑا پھرتا تھا۔ ان میں اتنا لطف پایا کہ اگر  
 کوئی بات کرے تو اس کا جواب دیتے تھے۔ اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش  
 کرتے تھے۔ اسی خیال میں یکا یک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی  
 صورت بھیا نک سورت اُس گھائی میں چلے آتے ہیں۔ کہ ان کی کسی کو خبر نہیں۔  
 ایک تو تو میں جانتا تھا کہ عمر ہے۔ مگر دوسرا افلاس تھا۔ ان کے دیکھنے ہی سارے  
 باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہو گئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش آرام کا خانہ ہو گیا۔  
 دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلائے تو گویا عالم  
 میں ایک کھرام مچ گیا۔ اسی سے میں بھی چونک پڑا۔ اور دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔

## سیرِ زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ زندگی ایک میلہ ہے۔ اور اس عالم میں جو رنگارنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے، تو جوان ہوئے اور پھر سختہ سال انسان ہوئے۔ اُس سے بڑھکر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے۔ جب اس نقرہ پر غور کی۔ اور آدمی کی اولیٰ بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گزرے۔ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے۔ کہ ہر دم اُٹنے اُٹنے چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے۔ کہ ابھی ایک چیز کا طلبگار ہوتا ہے۔ ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے اُس کا عاشق زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے۔ کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ بیزادہ ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعہ درد و مصیبت کی فریاد۔ خوشی کے ولولے۔ ڈر کی جینجین ہواؤں کے زور۔ پانی کے شور۔ ایسے اُٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا۔

اول تو دل بہت حیران ہوا۔ بعد چھوڑی دیر کے جو اس ٹھکانے ہوئے تو

لہ بہت سے گرم و سرد زمانے دکھتا ہے۔ نیشب و فراز عالم کے طے کرتا ہے۔ بچپن سے لیکر ساری جوانی تجربوں میں گزارتا ہے۔ جب گھس پس کر بڑھا ہوا لیٹتا ہے۔ تو ذرا آدمی بنتا ہے۔ اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سنے یا دیکھے اسے کچھ سمجھ بھی سکے۔ لہ ابھی ایک طرف نانچ رنگ شادی اور مبارکبادی ہے۔ ابھی دوسری طرف سے رونے پینے کی آواز آتی ہے۔ ابھی ایک گھر میں دولت و اقبال کا جوش و خروش ہے۔ ابھی ایک صدمہ ادا پڑا ہے۔ کہ ساری خوشیاں مٹی ہو گئی ہیں۔ ادھر آبادی ہے ادھر بربادی ہے ادھر ہوا سے ترقی و جوش اقبال ہے ادھر ادبار کی آندھی۔ ابھی عمر کا جہاز صحیح سلامت بادِ مراد پر چلا جاتا ہے ابھی طوفانِ تلاطم میں غوطے کھا رہا ہے۔

آس پان کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا۔ کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ اور اس غل کا کیا سبب ہے؟ ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب جاتے کہاں ہو۔ دریاے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی۔ کہ جس میں کچھ کشتیوں کی کمزوری سے کچھ ملاحوں کی غفلت سے کچھ ان کی بیوقوفی سے لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے وہ نہر تو ہم اتر آئے ہیں۔ اب بانجھدا کمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے۔ کبھی گرداب ہے۔ کبھی موجوں کے تختی پڑے کھٹا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انہوہ میں سے انتخاب کئے ہیں۔ جو رستے بتانے اور پار اتر دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے۔ مگر حقیقت میں نہ یہاں نا خدا کی پیش جاتی ہے نہ ملاح کی۔ فقط خدا کی آس ہے اور بس۔

سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

جہاز عبرت رواں پر سوار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے غور سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا اور دل نے کہا کہ پہلے ذرا نظر اٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوشنما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں ظاہر نہ کچھ زور تھا نہ شور تھا۔ مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا۔ وہ اُسے بلبلے کی طرح بھالے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیرا تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں ہے سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی بس نے آنکھ

لہ کر درکشتیاں بچوں کے نازک جسم اور دھان پان سے بدن میں لہ اس سے بچوں کے ماں باپ اور طبیب یا تیمار دار مراد ہیں لہ یہ جوانی کا عالم ہے اور دنیا کے حادثے ہیں جو کہ تلاش معاش اور راہ ترقی میں اسے پیش آتے ہیں لہ یہ بڑے بڑے عالم فاضل ڈاکٹر پروفیسر مولوی پنڈت ہیں جو ہماری تعلیم میں مصروف ہیں لہ فی الحقیقت دنیا کی ابتدا کس نے دیکھی ہے۔ جو آیا۔ یہی چلتا ہوا کارخانہ دیکھا۔ اور چلتا ہی چھوڑ گیا۔ لہ شعری

یہ چمن بوں ہیں رہیگا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بویاں سب بول کر اڑ جائینگے

کھولی تھی اپنے نہیں بلغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر بہر میں بہنا چلا جانا تھا۔ اور وہ ٹھنڈا ہی چھاتی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر میں کام نہ کرتی تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں۔ اور جا بجا گرداب پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں باد مراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے۔ اور جو بچارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر تھقے اڑاتے جاتے تھے مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہی گردابوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے۔ کہ ناواقفیت و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گردابوں میں ڈال دیتے تھے۔ اور موجوں کے پھٹیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا۔ اور کشتی کو اس کی ٹکڑیوں پر چڑھا لانے کا تو کیا ذکر ہے۔ اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے۔ یا کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آجائے۔ سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھا مگر سب سے سنبھالنے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطر نہیں۔ اگر ہے تو اور ہمسفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے۔ اور اپنی بد انجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اسی نصیبیت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بد اعمالی جو پر سے ہر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں۔ وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ ہر شخص خوش ہوتا تھا۔ اور دل میں اپنے نہیں

لہ خدا کے صلے غیب کے اندھیرے میں ہر کس کی عقل نہیں دیکھ سکتی ہے۔ لہ انہیں دنیا کے کمزورت۔ جسمانی جاہلیاں۔ دشمنوں کی برطانیوں۔ اور اپنی پرہیزیوں اور بے اعتدالیوں سمجھو۔ لہ یہ بااقبال اور کامیاب لوگ ہیں جن کی دنیا میں بن آئی ہے۔ لہ نادانوں اور جاہل دوستوں سے نہا جائے۔ لہ بھلا غرور تک آسکتی ہے اور جوان یا بڑھا آدمی بچ کر بکھر سکتا ہے۔ لہ انہیں انہیں کے مزے ہیں کیسا اندھا رویتے ہیں کہ انجام کے کمزورت اور خوف و خطر کچھ معلوم ہی نہیں ہوتے۔

مبارکباد دیتا تھا کہ الحمد للہ میری کشتی کو کچھ خطر نہیں ہے۔ جو گرداب آوروں کو نگل گیا۔ میں اس سے بچ جاؤنگا۔ اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا۔ میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤنگا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جازوں کی نیا ہی بھی دیکھتے تھے مگر اسی رستے چلے جاتے تھے اس پر بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے +

یہ سستی اور بے پروائی اُن کی کچھ اس لئے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے۔ کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے۔ داد بیدا کرتے تھے۔ اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آؤ۔ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر اخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حاکمیتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ ادھر ادھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ بہتیرے نیم جان۔ بہتیرے ایسی بیکسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جانا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کی مسیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا۔ مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا جس کشتی پر ہم سوار تھے حتیٰ یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریاے حیات

لے انہیں پرانی مارتیں۔ بڑے بڑے فاشنور اور سٹینوں کے سڈ کرے۔ اور نامی گرامی لوگوں کی یادگاریں سمجھو۔ یا پرانی عاتیں۔ قدیمی مقبرے اور پرانے قبرستان۔ یہی تمہارا جسم خاکی ہے۔ جیسے تم انہیں اچھی غذا میں کھاتے ہو۔ اور رزقوں سے تیار کرتے ہو۔ ہلاتے ڈھلاتے ہو۔ گرم سرد ہواؤں سے بچاتے ہو۔ اور جوں جوں بڑے ہوتے ہو وہ طاقت ہوتا جاتا ہے +

کی موجوں کے صدمے اٹھانے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ رستے ہی میں ٹوٹے نظر آتے تھے۔ اور سب ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو جو مست غفلت زندگی کے نشہ سے سرخوش بیٹھے تھے۔ وہ بھی نکلین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے۔ اور بزدلے نامردوں کو زندگی عذاب موت ہو گئی۔ بلکہ رنج و غم کے بعد جن جن احتوں کی امید ہوتی ہے۔ اُس سے بالکل بایوس ہو گئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطر تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے۔ بلکہ سب کا جی ہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطر کا خیال دُور ہی دُور ہے اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی جو اٹھائی نہ جائیں گی۔ وہ سامنے نگاہ بھر کے نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت کے لئے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے۔ امید تو ہمیشہ اس رستہ میں ساتھ ہی رہتی تھی۔ اُس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کی اُمید سے بہت راہ تھی۔ اُن سے اُس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کئے ہوئے تھے۔ مگر اُس میں اتنی سکت بھی نہ تھی جس کے سہارے سے بھاگ کر توجیح جلتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اُوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے۔ اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدہ پر راضی تھے۔ درحقیقت اُمید کی باتیں اُن سے مسخر اپن کے طور پر تھیں کیونکہ جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں اتنی ہی بے خبری کے عمد نامے تازے کرتی تھی۔ اور تعجب یہ ہے کہ جنہیں ڈوبنے کا یقین تھا۔ وہی کاروبار کے لئے زیادہ کمرکتے تھے۔

لہ دو تندر عیاش یا بڈھے زادہ خطر کی حالت میں ہیں۔ مگر انہیں کو غفلت زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ مرنے کی بات سُننے کو بھی جی میں چاہتا ہے۔ رگ رنگ تھے کہانیاں کھیل کود کی باتوں میں ایسے لوگ دل بہلایا کرتے ہیں۔

دریائے زندگی میں ایک بہت خوشنما جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارہ پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا۔ بداعتدالیوں کا گلزار۔ جہاں تک جزیرہ کی حد تھی وہاں تک پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور جتنی کھلی تھیں۔ نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔ جو انان مرغزار یعنی ہرے بھرے درخت ایک دوسرے کے گلے میں مٹھ ڈالے جھوم رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں میں آرام اپنی پلنگہ ہی بچھائے لیٹا تھا اور خوشی میٹھے میٹھے سروں میں پڑی ایک تزانہ لہرا رہی تھی۔ یہی مقام رہگذر عام کا تھا۔ اس لئے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے۔ یہاں کی سرسبزی ان کی آنکھوں کو ضرور طراوت دیتی تھی +

ادراک کا ناخدا داہنے ہاتھ پر دو رہن لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکرٹے رستہ سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی کھینے کے لئے ان سے ڈانڈ مانتا تھا۔ کہ صحیح سداست یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے۔ کہ جواب بھی نہ دیتے تھے۔ خواہ وہ خفا ہو کر کہے۔ خواہ منتوں سے ملنگے۔ تھوڑے ہی ہونگے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہونگے۔ اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے۔ کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیں۔ اور عہد لے لو کہ پھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکینگے نہ سمجھتے تھے کہ بڑتنا تو درکنار ان بلاؤں کے پاس کو نکلنا بھی غضب ہے۔ چھو اور مو +

میں نے دیکھا کہ آخر ادراک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے

لے عرواں کا جہاز چلا جاتا ہے۔ دنیا گذرگاہ عام ہے۔ راگ رنگ جن۔ و جمال میش و نشاط کے یہاں جگھٹ ہیں۔ دیکھنا! نہیں ان کے مزوں میں آکر کو دن پڑنا۔ ایسی چوٹ کھاؤ گے کہ ہسپتالوں تک جانے کے قابل بھی نہ رہو گے + لے غفل و ادراک نہیں ہر وقت بے اعتدالیوں اور بد پرہیزوں سے بچنے کو اشارے کرتے رہتے ہیں مگر ان بچاروں کی کون سنتا ہے +

دق ہو گیا اور جزیرہ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرہ نے کشتی کو اس طرح لھینچا جیسے مقناطیس سوئی کو کھینچے۔ جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت سچتائے اور بھنا زور تھا سب لگا دیا لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلا۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناپچ کو دو کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جانیں گنوا بیٹھے۔ ان جن لوگوں پر اوراک چاکبکست کی چالاکئی تدبیر کارگر ہوئی وہ بچے۔ مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے۔ اور نیکے تو جس طرح پہلے چلے جاتے تھے اسی طرح پھر موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے تلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی۔ اور یہ بھی باد مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لئے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے۔ ادھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے۔ مگر جو ڈوبتا تھا۔ اپنی کوتاہ اندیشی پر بہت سچتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرنا جاتا تھا کہ ع من نہ کر دم شامدر بکنید۔ خبردار۔ کوئی جزیرہ بے اعتدالی کے سامنے نہ آنا پ۔ خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے انکے کارگیر بھی وہیں موجود تھے۔ بہت لوگوں کو اپنے کارگیروں پر بڑا بھروسہ تھا اور بعض کشتیاں بھی ایسی تھیں کہ انہیں تھوڑا ہی سدھ پہنچا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ جنہوں نے تھوڑا سدھ اٹھایا تھا وہ بھی کچھ بہت نہ جسے روز بروز مرض بڑھنا گیا۔ آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کارگیروں نے خود انکی مدد میں پہلو بچایا۔ مگر بہتیرے کارگیر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے۔ کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے +

غرض سیر زندگی میں چالاک لوگوں نے بھی اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ بچھے

۱۔ یہاں سوئی اور مقناطیس کو نہ دیکھو اپنے اشنیاق اور رغبت کی باعتبار خیال کرو + ۲۔ بڑھوں کو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے کیسے چھونک چھونک کر دم رکھتے ہیں + ۳۔ یہ کارگیر حکیم جی ہیں یا ڈاکٹر صاحب + ۴۔ یہ حکیموں نے کہا۔ بیانے کا علاج کرو اس نے کہا حکیم کا علاج کرو +

ڈوبے وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہوں  
 کے ساتھ ساتھ چلے آتے تھے۔ انہیں غوطے کھاتے دیکھتے جانتے تھے اور آگے  
 بڑھے جانتے تھے یعنی باوجود مخالفت برابر غرق کئے جاتی تھی۔ نہ ان بچاروں کو محنت نہ  
 کرنی پڑتی تھی۔ نہ غم انتظار اٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی لڑکھاکر بیچ نکلے تھے  
 وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے  
 بہت لڑے مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا  
 تو یہی ہوا کہ امید کو بھی کنارہ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے یہ حالت دیکھ کر میرا دل  
 ایسا زندگی سے بیزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔  
 اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا  
 ہے اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے  
 اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیرا۔ اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا خدا جانے دو دریاں الٹی  
 سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کس جو ڈھواں دھار ہو رہی تھی اُسے اپنی برکت  
 سے اڑا دیا۔ دیکھوں تو سبحان اللہ صبح سعادت کا وقت ہے۔ چمن لہلہے مرغاب  
 سحر کے چھپے۔ پھولوں پر شبنم نیا اور نسیم کم کم۔ جزیرے کے جزیرے میوؤں  
 سے جھومتے اور پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ  
 جگمگ لہریں مار رہا ہے۔ بڑے بڑے امرا۔ شرفاقلعت ہاے فاخرہ اور زرق  
 برق کے لباس پہنے پھولوں کے طرے سر پر ہار گلے میں ڈالے ادھر ادھر  
 درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں۔ کچھ فتواروں کے بیچے حوض میں پاؤں لٹکائے  
 بیٹھے ہیں۔ کچھ پھولوں کی کبابیوں میں بے تکلف لٹتے ہیں اور گانا سن رہے  
 ہیں۔ غرض کہ ہجوم ہمارا۔ اور رسیلی آوازوں کے ستاروں نے وہ جگمگ کر رکھا  
 تھا کہ شور قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغر دل خوشی سے  
 چھلک گیا۔ رہے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آجائیں توڑوں اور

اس باغِ فرحِ بخش میں جا پڑوں۔ لیکن اس پیرِ بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں الا دروازہ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں۔ اور سمندر کی قالین پر گلکاری کر رہے ہیں حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری نظر کام کر سکے بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے۔ اس سے بھی آگے تک لا انتہا چلے جاتے ہیں۔ سرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحبِ دلوں کے گھر یہیں ہونگے۔ جن جن لذتوں کو جی چاہے اور طبعیت کیفیت اٹھائے سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغِ جنت کا مکان ہے۔ کہ اپنے اپنے ملکین کے لائق شان ہے۔ کیوں آزاد کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دیجئے اور انہیں لیجئے کیا اس زندگانی کو مصیبت سمجھنا چاہئے جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں؟ کیا موت سے ڈرنا چاہئے؟ کیا ملکِ عدم کو خوش ہو کر چلنا چاہئے؟ جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں۔ نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور سنتے ہو! نہ سمجھنا کہ انسان جس کے لئے یہ بے زوال سامان ہیں۔ اسیوں ہی پیدا کر دیا ہے۔ دنیا مقامِ امتحان ہے۔ ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

## انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بھیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت۔ اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھینگے۔  
ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

کہ اگر ہم اپنی اپنی ٹھیسبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی ٹھیسبت کو اچھا سمجھنا +

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے نیکے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اُٹھنا جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے۔ کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج و الم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ پناچہ اس مطلب کے لئے ایک میدان۔ کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ تجویز ہوا۔ اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے۔ لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں آؤر بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ٹھیسبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا +

ایک شخص سوکھا سہما۔ ڈبلا پلے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا۔ اس انبوہ میں نہایت چالاک کی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اُس کے ماتھ میں ایک آئینہ تھا۔ جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا۔ جس کا دامن دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیو زادوں اور جناتوں کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں۔ اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب و غریب صوتیں اُس پر نظر آتی تھیں۔ اُس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی۔ اور نام اُس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھوانا تھا۔ اور لہرانا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گرا گرا کر دیکھا۔ اور ان ٹھیسبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرا یا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا +

اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اُس نے ذرا میرا دل

بھلا یا صورت بھلاوے کی یہ ہوئی۔ کہ دیکھنا ہوں ایک شخص پرانے سے چکن کے چنمہ میں ایک بھاری سی گٹھری۔ لئے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی۔ تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینا بنتا تھا اور مارے بوجھ کے اپنا جاتا تھا۔ اُس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا۔ اور معلوم ہوا کہ اس کی جو رو بہت بُری تھی اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔ ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گردہ ہے ان کے سروں پر دو دو آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی۔ اور نالوں کے نیزہ و بالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے اُن کے پھٹ جائینگے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ کچھ جدوجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔

بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھڑیاں پھینک ہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت کچھ کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اُس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھنا ہوں۔ کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے۔ مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبار رنج و الم میں اپنے کپڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع و اقسام کے سقم اور امراض بھی تھے۔ جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ مخواہ انہیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا۔ جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں اُن سب کا

مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امر میں نوجوانی ہاتھوں میں لئے آتے تھے۔ مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا۔ اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بد اطواری نہ پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ ماشے دیکھتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوسہاے نفسانی اور ضعف جسمانی اور عیوب عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئیگا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے۔ اس نے بھی ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکینگے۔ مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و جیا کو پھینک گئے۔

جب نام بنی آدم اپنے اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے۔ مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ شیخ خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے۔ مگر انہوں نے جھٹ اپنا ایمنہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا۔ اور ایسا گھبراہٹ کا چہرہ کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا۔ اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرہ

لے مراد اس سے یہ ہے کہ اپنی بے وقوفی یا بد اطواری کو کوئی بُرائی نہیں سمجھنا اسی واسطے اسے کسی نے نہیں پھینکا۔

کے برابر تھی +

ہم اس انبوہ پر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے جو سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کر اب سب کو اختیار ہے۔ جس طرح چاہیں اپنے اپنے بیخ و تکلیف تبدیل کر لیں۔ اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں و ہم پھر مستعد ہوئے۔ اور بڑی تڑت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا۔ اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں +

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا درو قونج سے جاں بلب تھا۔ اور لاؤدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لئے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے در مذکور پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا۔ مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے اتنے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی کپڑی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درو قونج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا درو قونج مجھے پھیر دیجئے اور اپنا لڑکا لیجئے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا +

ایک بچہ راہ جازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے بسور رہا ہے +  
غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے

اپنے کئے پر پھینتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیار نے ان فلاس لے لی تھی وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے وق ہو کر اسے چھوڑا تھا اب وہ درد جگر کا مارا لوٹ رہا تھا۔ اور اسی طرح برعکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی +

عورتیں بچاری اپنے اڈل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا۔ مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ ننگراتی تھی اور لمبے لمبے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی۔ مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبے تھے۔ اس لئے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرہ کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکہ بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں۔ وہ حقیقت میں ہمارے سہارے بوجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ ستمے ستمے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے +

مجھے اس بُدھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوبصورت سجیلا جوان بن کر چلا۔ مگر شانہ میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑھی ٹیکتا گزرتا پڑتا چلا جاتا تھا کمر جھکی ہوئی گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ کھوے سر سے اونچے نکل آئے تھے۔ اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں ان کا غول گرد تھا۔ یہ انہیں دیکھنا تھا۔ اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مہاد لے بیان کئے ہیں تو اپنے مہاد لے سے بھی مجھے صاف نہ گزر جانا چاہئے چنانچہ اسکی صورت حال

یہ ہے کہ بڑے چہرہ والے یار میرے چھوٹے چہرہ کو لے کر ایسے بدناما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی۔ اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرمایا گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی کیونکہ جب میں اپنی پیشانی سے عرق ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھنا تو کہیں نھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جب چہرہ پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹک کر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر ہنسنا کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدر اکر چلتا تھا! اس نے ایک لمٹنگو سے مباد لہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی ان دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے! سر کا یہ عالم تھا گویا وہاں اڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے قدم اٹھاتا تھا مگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھینچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقیت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سو آدمی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں بے ہونے اور پرستلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میں ان گریہ وزاری۔ نالہ و فریاد۔ آہ و افسوس سے ڈھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو میکس آدم زاد کے حال دردناک پر پھر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انہیں بل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی اُن وبالوں کو سرو گردن سے اُتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انہیں دھوکے میں

ڈال رکھا تھا وہ شیطانِ نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اُس کی جگہ ایک شیشہ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوشنما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمتِ الہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کو مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا جو کہ مذکور خود بخود سنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلثت رہ گیا۔ پھر اُس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ۔ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اُس کا شکر یہ کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لا انتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چٹنا نہ پڑا۔

## علوم کی بد نصیبی

تمہید

تمام صاحبِ جوہر اور کُل اہل کمال ہمیشہ سے اُن نالائقوں اور غلط ناکاموں کے ہاتھ سے نالاں ہیں۔ جو فلک کی سفلیہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہولے مراد کے بیلیوں میں نیٹھے ہیں۔ اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملہ میں اہل علوم سے زیادہ کوئی واجب الزحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحبِ صنعت پیدا ہوتا ہے پھر اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص علم کی قدر دانی پر منحصر ہے۔ لیکن بنیاد اُس کی حکام با اہل دول کی بدولت قائم ہوتی ہے۔ اسی واسطے اس کی رونق بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حدِ قلم سے باہر ہے۔ اول تو اہل کمال ہمیشہ کم۔ اور بے کمال انبوه در انبوه ہیں۔

ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اڑاتی ہے کہ ان کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ ان کی بد نصیبی یہ کہ جن قدر دونوں پر مدار کار ہے۔ کبھی کثرت کار سے۔ کبھی بے پروائی سے۔ غرض ٹھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کام کے لائق نہیں۔ اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ٹہرنا آ پڑا تو آپڑا۔ نہیں تو ذلت۔ تباہی اور در بدری کے سوا کچھ حاصل نہیں ان ناگوار باتوں کو غلط ناما کمال گوارا کر لیتے ہیں۔ مگر اصل باکمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اٹھاتے ہیں۔ در بدر پھرتے ہیں۔ خوشامدیں کرتے ہیں غرض کہ اس رستہ کی منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ ایک افسانہ کے استعارہ میں بیان ہوتی ہیں :-

## آغازِ مطلب

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی۔ ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لئے محنت کر رہے ہیں اور جس صدق دل سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جو ہر کمال سے کچھ واسطہ نہیں اور انسان کی نفع رسانی کی بھی کچھ پرواہ نہیں رکھتے وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطان آسمانی کے دربار میں عرضی کی خلاصہ جملہ یہ کہ انصاف و عدالت کے بموجب تمام مریدان خدمت گزار کو بمقتضائے انصاف و عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں۔ دربار میں مشتری صدر اعلیٰ اور عطار و دیر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور اداے خدمت میں مشقتیں تھیں سب جتائی اور دکھائی گئیں۔ اور حق تلفیوں کا دعوہ نہ کیا گیا۔ معلوم

ہو کہ فی الحقیقت عالم خاک میں علوم و فنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا  
 شکر یہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق  
 ہو گئے ہیں۔ کہ یقین ہے چند روز میں دُنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف چلے آئیں۔  
 اور اگر وہ دُنیا میں نہ رہے تو حضرت انسان جنہوں نے یہ شوکت و شان بنائی  
 ہے حیوانوں سے ہد ترزہ جائینگے۔ پھل پھلاری گھاس پات چرتے پھرینگے۔  
 جنگلوں کے جانور بن جائینگے اور جو ان سے زیادہ وحشی ہونگے وہ انہیں بھاڑ  
 کھائیگے۔ اس کے فیصلہ کے لئے عالم بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو اراکین  
 دربار کا رنگ ہوتا ہے وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے چنانچہ سب کا اتفاق ملے  
 اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہئے۔ ملکہ کو کب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ  
 باپ اُس کا عالم خاکی سے تھا۔ مگر اُس کے نور جمال اور حسن کمال نے تمام عالم بالا  
 کو روشن کر رکھا تھا۔ اور صداقت و حقیقت کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اسے  
 حضور سے ملکہ علم افروز کا خطاب عطا ہوا اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا۔  
 جس میں آفتاب کی طرح فہم و ادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں۔ رفعت کا تخت  
 پھولوں سے سجایا۔ اس پر ملکہ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان  
 نے تارے تارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اُڑایا۔ اُس نے بھی عالم  
 میں آکر باپ کی طرف سے وہ شوکت و شان لیاقت کی دکھائی جس سے تمام  
 بے لیاقت تھرا گئے۔ اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ خاک کا کرہ  
 نور کی تمذیل ہو گیا۔ دن رات دربار جاری تھا۔ علوم کے مسائل اور انکی تصنیفات  
 کے منقدمات پیش ہوتے تھے۔ استاد یعنی صداقت کی طرف سے مسانت  
 اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھیں۔ چنانچہ علوم و فنون جن لوگوں کی سفارش  
 کرتے تھے۔ وہ ان ہی کے ذریعے سے آکر پیش ہوتے تھے +  
 عالم مانا کے لوگ علم کے عاشق تھے۔ سب اُس کی فرماں روائی دیکھ کر

بہت خوش ہوئے۔ جلوس دربار کے لئے ہر طرح کے سامان بھیجے اور بارگاہ شاہی نے عجب شان و شکوہ حاصل کی۔ جب دربار میں آکر بیٹھتی تو عدل انصاف کھوٹے کھرے کے پر کھنے کو کھڑے رہتے۔ اُمید سامنے ناچا کرتی۔ قدر دانی دست راست پر کھڑی رہتی اور سخاوت کے اشارہ کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے +

ایک دن ملکہ علم افروز اپنی رفعت کے تحت ہوا دار پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلی۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گزر ہوا۔ کوہ مذکور پر جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی۔ کہ دامن کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھواں سے گھٹ رہا تھا اس کے قدم سے سیاہی کے دھوئیں اڑ گئے اور تمام تاریکی برطرف ہو گئی۔ یہاں اگر چھاؤں بھی تھی۔ تو نہ بارش کی سیرابی سے بلکہ گھٹاؤ کے پسینے سے سبل رہی تھی۔ اب اُس نے اپنی سرسبز کوہرا کیا۔ کچھ پھول تھے روشنی بغیر ٹھہر رہے تھے۔ وہ بھی چمک کر رنگ نکال لائے۔ غرض ہر شے کی طبیعت اپنی اصلیت پر آکر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی۔ اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا +

رو سے زمین پر بہا رکا یہ عالم دیکھ کر سلطان آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اٹھا دو۔ عالم بالا کے پاک ہنادوں نے گلدستے ہاتھوں میں لے لئے اور خوش ہو کر پھول اُچھالنے لگے +

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گلزار اور شادابی سے نو بہار دیکھا تو علم تعجب و ماں آیا۔ اپنے کمال سے ایک محل عالی شان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گلزار لگایا۔ طرح طرح کے اوزار کام میں آئے۔ رطکیں نکالیں۔ اُتار چڑھاؤ درست کئے۔ ریلیں جاری کیں۔ جا بجا فرود گاہیں اور اُن میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے

لے بند اور گھٹی ہوئی جگہ میں نہ بنانا ت بڑھنے میں نہ اُن کے چول کھتے ہیں نہ پھل لگتے ہیں۔ سوج کی روشنی اور چلتی ہوئی ہوا کو اس میں بڑا دخل ہے یہ نہ ہونو سب ٹھٹھ کر رہ جاتے ہیں +

غرض عجائبات و ذغائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی و وسعت حاصل ہو۔ اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لئے سامان بہم پہنچیں۔ چنانچہ ملکہ نے یہیں سکونت اختیار کی قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی اور عدل بے رور رعایت دے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ اُمید دروازہ پر بیٹھی رہتی تھی۔ اور جن کے لئے علوم و فنون سفارش کرتے تھے انہیں بلا لیتی تھی۔ تمام دربار کثرتِ خلائق سے بھرا رہتا تھا۔ اور ہر چند اکثر اشخاص ناکام بھی جلتے تھے مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے ان کا نام نالائقیوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا پھر وہ عالم شہرت سے خارج ہو کر یا تو گناہی کے گوشہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ کہ کوئی انہیں پوچھتا نہ تھا۔ یا ہیچ و پوچ اور واسیات کاموں پر تھک پڑتے تھے۔ بعض ایسے بھی ہوتے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نفس کی تکلیف میں کوشش کرتے تھے ۛ

اب اہل نذر غبار ہی میں گیس لگائیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے  
 نبار آندھی ہو کر اٹھتے ہیں۔ ان کے اقبال کا دور آیا ہے

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے۔ نہ شرمندگی کے گوشہ میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دیے۔ ہر چند ملکہ نہ کہہ سکا جوہر افلاک تھا مگر باپ کی طرت سے پیوند خاک تھا۔ اس لئے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوتی تھی اور اگرچہ اس خطا کی اصلاح بھی بہت بلد ہو جاتی تھی۔ مگر پھر بھی حریف جو آک میں لگے ہوئے تھے انہیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ اپنے۔ کچھ اپنے رفیقوں کے

گھروں میں کیٹیاں شروع کر دیں اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دئے۔ تمام عالم میں رفاہ عام رفاہ عام اور اصلاح اصلاح کا نام کر کے فریاد بچاؤی جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہو گئی۔ صبح و شام جمع ہوتے۔ لمبی لمبی تقریریں کرتے۔ مگر اُس میں مطلب کا نام نہیں۔ جھوٹ موٹ کی بکواسیں کرتے جنہیں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر راسے دیتا۔ کوئی شمشاد قدر ہو کر راسے شامل کرتا۔ کوئی تائید کرتا۔ کوئی تسلیم کرتا۔ آپ ہی اتفاق راسے کر لیتے۔ آپ ہی واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ کر لیتے۔ اسی تو وہ طوفان کو لکھتے اور پروسیڈنگ (روڈاؤ) نام رکھتے۔ جسے شہر کر کے بڑے فخر کیا کرتے ۛ

ان ناکاموں کی اُمید سے راہ بھٹی۔ اور بیجیائی ان کی بڑی خیر خواہ بھٹی چنانچہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرت دھکیلتی رہتی تھی کہ چلو اور دوبارہ دعوئے پیش کرو۔ اگر چہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے نکالے جلتے تھے۔ اس پر بھی اُمید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ بھٹی۔ اور بیجیائی برابر زور لگاتے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ انہوں نے ایک اور رستہ نکالا۔ یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری۔ جو اُمید کی حمایت اور بیجیائی کی عنایت سے روز افزوں ہے اس کی کثرت ہمیں ضرور فتحیابی بخشگی پس جس طرح ہو سکے اپنی بھٹی بھاڑ کو بڑھانا چاہئے ۛ

جب پروردگار کسی بندہ خاص کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے

بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے تو خواہ مخواہ کے خیر خواہ مشورت

دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر دیکھو! ان کی باتوں میں آکر حقیقت اور

واقعیت کو نہ بھول جانا چاہئے خیال کر کے سُنو یہ خیر خواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں

اُدھر تو بے لیاقت اہل فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے اُدھر یہ قدرتی پیچ پڑا

کہ ملکہ کو آسمان سے اترے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ عالم خاک میں آکر نیت اُس کی

پستی کی طرف زیادہ تر مائل ہونے لگی۔ اور عدل و انصاف کی نصیحتیں سب بھول گئی۔ یا تو صحبت اس کی علوم و فنون سے تھی یا غرور سے دوستی ہو گئی۔ آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لیا۔ اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم و راہ برہمی کہ اس سے شادی ہو کر دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ایک اُن میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی۔ خوشامد نے فیاضی سے فیض تعلیم پایا تھا اور خام خیالی نے قسمت سے +

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں جن کا اس نے دو دو پایا تھا۔ دوسری دایہ خود رانی تھی اُس نے پالا تھا۔ ملکہ علم افزا نے یہ غضب کیا کہ ساری خوبو خاند کی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ خود رانی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے۔ صداقت نے جو سبق پڑھائے تھے۔ سب بھلا دئے۔ اور عدل تو بیکار ہی ہو گیا، جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا۔ اس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہو گئے۔ وہ بچارے مجھے چراغوں کی طرح طاقتوں میں پڑے رہتے۔ ملکہ کائنہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ انجام اُس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کر کے راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے برسوں کی دشکاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے مگر صلہ کے نام خاک بھی نہ پاتے۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے اُن کے لئے سب کچھ موجود تھا +

جب ارکان سلطنت کی بے اعتدالیاں مد سے گزر جائیں تو اہل فساد کیوں نہ سر اٹھائیں

جب دربار کا رنگ اس طرح بنے رنگ ہوا۔ نہ علوم کے قدردان وہاں رہے نہ فنون کے جوہر شناس۔ تو چرچے اُس کے جا بجا پھیلے اور اُن نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں جن کی علوم سفارش نہ کرتے۔ چنانچہ یہ خبریں سن سن کر اُن کے

ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں۔ وہ ملکہ کے دل سے دشمن بدخواہ تھے۔ ان باتوں کو اُس کے زوال دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ تر سرگرم ہوئے ادھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ اُمید خام خیالی کے آنے سے خوش تھی۔ ادھر بیجیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی۔ دشمن مخفی جو شیطانوں کی طرح لپٹے ہوئے تھے ملکہ کو اُن کا خیال بھی نہ تھا۔

حضرت انسان کا قاعدہ ہے۔ کہ جب اپنے اوج پر آتے ہیں

تو اسیت کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں بروں کو

بڑھاتے ہیں۔ ویسے ہی اپنے کئے کی سزا پاتے ہیں۔

نظام افسوس یہ ہے کہ اب ملکہ کی شان شاہی نہ رہی۔ دکھاوے کی رسموں پر لگتی۔ زبانی خرچ بہت۔ باقی نہ ارد۔ مبالغے۔ استعارے۔ بلند پروازیاں لغالیاں حد سے زیادہ مضمون و مدعا غائب۔ کتا میں جلدیں کی جلدیں۔ مطلب پڑھو۔ تو ایک حرت نہیں۔ یا تعریف اور خوشامد۔ یا بے لطف اور بے معنی عبارتیں۔ انجام یہ ہوا کہ فقط اوپر اوپر کے توڑکے و احتشام تھے اندر کچھ نہ تھا۔ یا تو ہر عرضی فوراً سنی جاتی تھی اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی یا باہر ایک ابوان بوا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا۔ کہ اُمیدواروں کا جاگڑا حاضر ہوا کہیں جن لوگوں کو بیجیائی خوشامد کے سپرد کرتی تھی۔ وہ بے روک اس گھر میں چلے جاتے تھے۔ کوئی مزا حتم نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آکر بھر گیا۔ ملک ملک کے لوگ چلے آتے تھے۔ اور فقط حامی تہیوں کے بھروسے پر اس جوش و خروش سے اظہار کمال اور امتحان دینے کو پڑھتے تھے کہ ایک پر ایک گرتا تھا۔

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرضندوں کے خیالات اس سے زیادہ بگڑ جاتے

ہیں مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم میں غریب غرضندوں پر کیا گزرتی ہے۔

جو لوگ اس دربار عام میں شریک ہوتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت

میں پہنچ لئے کیونکہ ان کے لئے بڑا قوی وسیلہ تھا۔ یعنی خوشامد۔ خوشامد کے  
 ہاں حقیقت اور واقعیت دونوں کو دخل نہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہاں سے  
 معاملہ قسمت پر جا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے  
 سپرد تھا اور وہ اپنے دل کی راہ تھی جب چاہتی تھی کھول لیتی تھی جب چاہتی تھی  
 بند کر دیتی تھی۔ غرض کہ بد نصیب عرضی دار اپنی ساری عمر غزب اس بد حال میں برباد  
 کرتے تھے۔ کہ کبھی آس کبھی بے آس۔ ابھی خوش ابھی ادا اس۔ اس ایوان کے  
 اندر وسواس داروغہ تھا اور امیدواروں کا یار بنا ہوا تھا وہ دمدم آنا تھا اور  
 ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو  
 اور امید کہتی تھی کہ ہاں ہاں۔ اب حسن قبول کا خلعت دلوانی ہوں +

ساتھ اس کے رشاک ڈیوٹری کا داروغہ تھا اس کے گھر میں رات دن آگ  
 پڑی دکھتی تھی۔ یہ سب اسی کی سپردگی میں تھے۔ اور باوجودیکہ اس حال تباہ میں  
 گرفتار تھے۔ مگر بد قسمتی یہ کہ اب بھی اتفاق نہ کرتے تھے ایک ایک کو دیکھتے تھے  
 اور جلے مرتے تھے۔ اور آپس میں لڑتے تھے۔ عمارت مذکور میں اندھیر چھایا تھا۔  
 دیواروں پر آٹو بول رہے تھے۔ گرد بدنامی کی چمکا ڈریں اڑتی پھرتی تھیں۔ ان کی  
 آنکھوں میں علم کی شعاعیں سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں۔ اور پروٹ سے ایسی خرابی و  
 خواری کی بوندیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں داغ پڑ جاتا تھا +

حقداروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے

مگر نہ اس قدر کہ طوفان نوح کا مقابلہ کر کے

ہر چند جس شخص کے داغ لگتا تھا نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی۔  
 مگر خدا جلنے بڑھا پا تھا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ

لے یہ بہودہ بے کمال۔ اور کتنے چین معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر ان کی آنکھوں میں چھتے ہیں۔ اور  
 خواہ خواہ عیب نگاروں کی تصنیفات کو خراب کرتے ہیں +

بیچاری ہر چند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اُس دھبے کو چھپا دے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچا تھا۔ ذرا سا پانی لگنے سے یاد ہو چسپاں رہنے سے اڑ جاتا تھا۔ کہ اُس سے دھبے اور بھی روشن ہو جاتے تھے اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا۔ اُس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے مگر وہاں سے اس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں اگر لانا تھا تو وقت ہی لانا تھا۔

طوفان بے تیزی میں تدم رکھنے کو جگہ لے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے

چونکہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تباہی کی حالت میں دیکھیں اس لئے اکثروں کو لے لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی تاک میں لگے رہتے تھے اور جب موقع پاتے کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خلوت میں جا پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھ کر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی۔ یعنی منتظر خانہ میں حاضر ہوں۔ وہاں کوئی ان کی سُننا نہ تھا کیونکہ ان بچاروں کو نہ فقط رشک بلکہ وسواس بھی ستاتا تھا۔ بیچاری ایک چیخ مار کر کستی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھس آئے اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھی کہ جاؤ داغ لگا دو۔ اجاروں میں چھاپ دو۔ اشتہار دیدو۔ سارے جہان میں رسوا کر دو۔ یہ بچارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے۔ کسی کی کتاب چھٹ پڑتی تھی۔ کسی کا عامہ رہ جاتا تھا۔ مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے۔ جو جو داغ لگ جاتے تھے وہ نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور جن کے وہ داغ لگا ہوتا تھا لوگ دُور ہی سے تار جلتے تھے کہ یہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانے کی ہوا کھا آئے ہیں۔

غرض مند بچارے ہر طرح ادا سے خدمت کو حاضرین کا شکر وہاں قبول ہو

باقی اُمیدوار اس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ کہ کب خام خیالی

لے زمانہ کہ ہنر کا دشمن ہے۔ کیسا ہی اندھیر بھارے۔ مگر خود بخود ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ  
دو کا دو پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے +

اندر آنے کو اشارہ کرے۔ اور کب ہم حضور میں بار یاب ہوں۔ یہ غرض مند بچا رہے  
 احتیاج کے مارے اُسے خوش بھی کرتے تھے۔ مگر نہ فصاحتِ اصلی۔ یا اشعارِ اعلیٰ  
 یا خیالاتِ عالی سے۔ بلکہ بر خلاف اس کے جھوٹی داستانیں عاشقانہ افسانے۔  
 زلمیات ڈھکوسلے۔ کہ ان میں ملکہ کی بھی تعریف ہوتی تھی۔ اور اس کے شوہر یعنی  
 غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔ غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سُنی  
 جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی چٹنگیوں میں اُڑا دیتی تھی۔ کچھ بددماغی کی چین جبین  
 میں چلے جاتے تھے۔ بعض اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی  
 گئے۔ اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے جن کی انہیں خود  
 بھی اُمید نہ تھی۔ مگر تخت کے پانداڑ میں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں۔ جھٹ  
 گلے میں ڈالیں۔ اور وہیں باندھ دیا کہ ہر دم زیر نظر رہو۔ مگر اشاروں پر کام کرو۔ اور  
 اسی طرح زندگی بسر کرو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ اُن زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے  
 تھے اور کیسے ہی نازیبا اور بے عزتی کے کام لے۔ بلکہ گالیاں بھی دے تو پیشانی  
 پر بل نہ لاتے تھے اس پر بھی خام خیالی جب چاہتی تھی پکڑ لیتی تھی۔ اور زیور  
 لباس اُتار۔ پھر منتظر خانے میں دھکیل دیتی تھی ۛ

یہ لوگ وہاں آکر پھر طوفان بے تمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ ہاں بعض  
 اشخاص جنہیں تجربہ کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا۔ وہ تو کسی اور رستے سے ہو کر  
 نکل گئے اور کوئی اور خوشحالی کی راہ ڈھونڈ لی۔ باقی وہیں پڑے رہے۔  
 عمر گزارا گئے۔ اور خوشامد کے ذریعے سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔  
 اتنے میں ایک اور بھیڑ کا ریلہ آ گیا۔ چنانچہ جب جگہ نے تنگی کی تو گرد مکان نرکو  
 کے بہت سے کمرے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو حیثیت کے بموجب  
 بیماری۔ کاہلی۔ سُستی۔ شرمندگی۔ مفلسی۔ مایوسی کے کمروں میں ڈال دیا۔  
 کہ وہاں وعدے۔ اور وعدہ شکنی۔ خوشی اور ناخوشی۔ اُمید اور نا اُمیدی

میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں۔ اور آخر ملکِ عدم کو پہلے جائیں ۞  
دیکھو صبح کے رستہ بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں۔

علوم و فنون نے بھی بہت سے دھکے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان میں رہنا عزت نہیں۔ بلکہ بے عزتی ہے۔ ملکہ کے محل سے نکلے۔ تمام دنیا میں بھرے۔ تکلیف و مصیبت کے سوا کچھ نہ پایا۔ اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گزر ہوا۔ ایک بہتے چشمہ کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان۔ اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی آرام گاہ یہی ہے۔ وہ تحمل کی بیٹی تھی اور قناعت کی گود میں پلی تھی۔ چنانچہ سب سے الگ اس گوشہٴ عافیت میں پڑی رہتی تھی۔ اور کنج عافیت اُس کا نام رکھا تھا۔ یہ مقامِ علوم و فنون کو بھی گذران کے قابل معلوم ہوا۔ وہاں جا کر دیکھا تو دانائی۔ دورانہیسی۔ کفایتِ شکاری بھی موجود ہیں۔ علوم نے چند روز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور آزادی کے دامن کے نیچے اپنی عزت اور آسائش کو چھپا کر زندگی بسر کرنے لگے۔ اے اہل علم! اب وہی زمانہ ہے۔ عزت و آسائش چاہو تو اس طرح گزارہ کرو ۞

کیوں آزادو! مجھے تو اُن لوگوں پر رشک آتا ہے جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشہٴ عافیت میں بیٹھے ہیں۔ اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں۔ نہ انعام سے خوش نہ محرومی سے ناخوش۔ نہ تعریف کی تمنا۔ نہ عیب چینی کی پروا۔ اے خدا دل آزاد دے اور حالت بے نیاز ۞

# علمیت اور ذکاوت کے مقابلے

تہدید

جو لوگ علم و کمال کی مسندیں بچھا کر بیٹھے ہیں۔ ان کی مختلف قسمیں ہیں۔ اول وہ اشخاص ہیں کہ جس طرح علم کتابی اور درس و تدریس میں طاق ہیں اسی طرح حسن تقریر اور شوخی طبع میں براق ہیں۔ دوسرے وہ کہ ایک دفعہ کتابوں پر عبور کر گزرے ہیں۔ مگر پھر خالی ہڈیاں سمجھ کر ان کے درپے نہ ہوئے۔ ان ایجاد و اختراع پر مرتے ہیں۔ کبھی تقریر کرتے ہیں کبھی تخریر کرتے ہیں۔ مگر اپنے اپنے موقع پر یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ قلم سے موتی برستے ہیں۔ اور منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ تیسرے ایسے بھی ہیں۔ کہ پیٹ کی الماری میں جہان کی کتابیں بھرے بیٹھے ہیں۔ لیکن تقریر کے میدان اور ایجاد کے موقع پر دیکھو تو فقط مٹی کا ڈھیر ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اخیر کے دونوں با کمال ایک دوسرے پر حریف رکھتے ہیں بلکہ حریف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان دونوں کی ہمیشہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں۔ اور مناظرے اور مباحثے جو آئے دن جاری رہتے ہیں۔ ان میں مختلف منزلیں پیش آتی ہیں کہ جن کے آثار چرٹھاؤ سے اور اپنی غلطیوں کے سبب سے بار بار زقار کے ڈھنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی طبیعتیں بھی مختلف ہیں۔ اسی واسطے دونوں کے طرفداروں سے دو جھٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے مباحثوں اور مقابلوں میں عجیب عجیب لطف دیکھنے میں آتے ہیں۔ جن کے نشیب و فراز کو نظر غور سے دیکھنا اقلیم علم کے ستاروں کے لئے ایک عجیب تماشا ہوتا ہے۔ یہ ایسا

لے انگریزی میں وٹ اور لرننگ کا۔ مباحثہ تھا۔ میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا۔ کوئی لفظ نہ ملا۔ ناچار ذکاوت لکھ دیا۔ اس میں جو لفظی قناعت اور معنوی کوتاہی ہے۔ سوزا ہر ہے۔ مگر اور لفظ اتنا بھی نہ تھا۔ مجبوراً قناعتوں کو برداشت کیا۔ کیونکہ غرض مطلب کے سمجھانے سے ہے۔ جو صاحب اس سے بہتر لفظ بائیں تخریر فرمائیں +

ہے۔ جیسے تمہیں کسی گلزار ملک کی سیاحی کا شوق پیدا ہو۔ اور ادھر کے کسی مسافر کا ایک سفر نامہ مل جائے یا اُس سرزمین کا ایک نقشہ ہاتھ آجائے۔ کہ گھر بیٹھے وہ لطف حاصل ہو جائے۔ داستانِ مفضلاً ذیل ان معرکوں کا ایک مرقع کھینچ کر دکھاتی ہے:-

### صورتِ معرکہ

کہتے ہیں کہ اقلیہ خیال میں ایک وسیع ولایت تھی جس کا نام ملک فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا۔ بادشاہ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا۔ یہ سیدھا سادا شخص حسن منات میں باپ کا خلف الرشید۔ اور نمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا۔ اُسے علم کہتے تھے۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی کہ باپ کے سببے خوش بیانی میں اسمِ ہاشمی اور ماں کے اثر سے زندہ دلی۔ اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختہ کو شرمندہ کرتی تھی۔ چونکہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونو سوکین تھیں دونو بچوں نے بگاڑ کا دود پیا تھا۔ اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں۔ کہ ایک ایک کو خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا۔ باپ نے دیدہ دور اندیش سے اُن کی ناانفاتی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لئے تھے اس لئے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنائیت کی گرمیِ محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظر محبت کو دونوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ مگر باپ کی شفقتِ منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا۔ کیونکہ ماؤں کی طرف کی عداوت دُور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ اور بچپن کے خیالات کے ساتھ بل کر آہستہ آہستہ بہت دُور تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ نئے نئے موقع جو پیش آتے تھے۔ اُن میں عداوت مذکور اور بھی بچنے ہوتی جاتی تھی۔ مگر

اس میں شک نہیں کہ دونو کے دونو خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پتلے پتلے تھے ۛ

جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالم بالا کے پاک نھا دوں کی نظر ان پر پڑنے لگی۔ اور وہاں کی مہمانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد ذکاوت نے باپ کے اشارے سے اپنے نشاط محل میں بڑے بڑے اہل کمال کو جمع کر کے رقا ص فلک یعنی زہرہ کی ضیافتیں کرنی شروع کیں۔ مگر ان جلسوں میں علم کا سانگ بھرا اور اس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو ٹٹا لٹا دیا۔ علم نے بہت برا مانا چنانچہ اُس کے توڑ پر قاضی افلاک یعنی مشتری کی ضیافت کی۔ اور اپنے زور علم سے شہزادی ذکاوت کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طراویوں کی قلمی کھولنی شروع کی۔ اور مشتری نے عطار د کے اتفاق رائے سے عمامہ فضیلت اُس کے سر پر بندھوا دیا۔ اسے ندبیر اور تقدیر کا انقلاب کہتے ہیں۔ کہ ماں باپ نے جن لوگوں کو مؤید سمجھ کر فہمائش اور اصلاح کے لئے کہا تھا وہی چمکانے لگے۔ اور نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ عداوت کی آگ اور بھی بھڑک اُٹھی۔ اسی عالم میں دونو بڑے ہوئے اور اب انہیں عالم قدس کے دربار میں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ مگر وہ بھی اس لئے نہ تھا کہ خود کچھ عزت و حرمت حاصل کریں۔ بلکہ ہر ایک کی غرض یہ تھی کہ اپنے حریف کی عزت کو خاک میں ملائے اور جو کچھ اپنے ڈھنگ میں اس نے زور پکڑا ہے اُسے آگے نہ بڑھنے دے۔ آخر کار دونو کے جمال و کمال کی بدولت وہ دن آپہنچا کہ رسم و رواج کے بوجب دربار آسمانی میں پہنچے۔ اول علم نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونو ہاتھ

لے دیکھو! ہمارے بھائی بندج آپس میںباحثہ کرتے ہیں۔ یا لوگوں پر اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں تو زیادہ تر حریف برا اعتراض کرتے ہیں۔ اور اُس کے خراب کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ تصنیف و تالیف دکھا کر اپنے کمال کی تقویت نہیں کرتے ۛ

اُٹھائے۔ اور چند فقرے شنائے الہی اور دعاے بادشاہی میں اُس حُسن تاثیر سے ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں اور سینہ ہائے گرم کے جوش سے محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اُس کے ذکاوت آگے بڑھی۔ زمین خدمت کو بوسہ دیا مگر جب سر اٹھایا تو چند شعر پڑھ کر ایک تبسم زیر لب کیا۔ کہ گویا ایک چمن بھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہوا کہ دونو عالم بالا کے پاک ہنادوں میں داخل ہو گئے اور خواجہ خضر نے اپنے مبارک ہاتھ سے آب حیات کا جام بھر کر دیا کہ جب تک آسمان پر چاند سورج کا چاندی سونا ہے۔ تمہارا سکہ روئے زمین پر چلتا رہے دربار آسمانی میں قدیم سے ملنساری اور اخلاق کا انتظام تھا۔ افسوس یہ کہ اُس وقت سے اس میں خلل آ گیا۔ کیونکہ دربار میں داخل ہو کر دونو نوجوانوں کے دماغ بگڑے اور دل نمود اور افتخار کے جوش سے بھرتک اُٹھے۔ پھر اُس پر ساتھ والوں کی داد و اغضب تھی۔ کہ ادھر اُسے بڑھاتے تھے۔ ادھر اُسے چڑھاتے تھے۔ مگر ان حملوں کی بوچھاڑیں دونو کے جی چھڑوائے دیتی تھیں۔ جن کا تار نہ ٹوٹتا تھا اور فتح کا یہ حال تھا۔ کہ ادل بدل کرتی تھی۔ کبھی ادھر کا پلہ جھکا دیتی تھی۔ کبھی ادھر کا۔ ایک بالکل مغلوب نہ ہو جاتا تھا کہ دو ٹوک ہو کر فیصلہ ہو جائے۔ جس وقت کہ بحث شروع ہوتی تھی تو ذکاوت اس زرق برق اور طمطراق سے آتی تھی کہ سب کو اُس کی جیت نظر آتی تھی۔ بلبل کی طرح چمکتی۔ اور پھولوں کی طرح مہکتی۔ پہلے ہی حیلے میں تمام محفل مارے خوشی کے اس طرح چمک اُٹھتی تھی گویا کبھی نہ بھگیگی۔ اور علم روکھی پھینکی صورت بنائے اپنے زور کو ذرا دبائے رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ تعریفوں کا جوش و خروش بگولے کی طرح گزر جاتا۔ مگر اس کے بعد جو ٹھیراؤ شروع ہوتا وہی علم کی طرف سے پکارتا تھا کہ اب ذرا ٹھیرو گے تو خاطر جمع سے سنو گے۔ پھر علم بھی دبیعتے شروع کرتا۔ یہ عالمانہ دبیعتے روکھے سوکھے تو ہوتے تھے۔ مگر اُن یں یا تو حریف

کے اعترافوں کو آپس میں لڑا کر اُس کی باتوں سے اُسی کو جھوٹا کر دیتے تھے۔  
 یا یہ ذہن نشین کر دیتے تھے کہ ذکاوت کے دلائل اصلاً قابل وقار و اعتبار  
 نہیں یعنی اُس نے سارے مقدمہ کے مطلب کو تو لبا ہی نہیں۔ ایک۔ ایک ٹکڑا  
 توڑ کر اُس پر بانوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ اس تقریر کو سن کر سب آپس میں تصدیق  
 و تسلیم کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مگر پھر جبکہ ذکاوت کی ریلی آواز نکلتی تو سب  
 کے کان اُدھر ہی لگ جاتے۔ شور و غل چپ چاپ اور ساری محفل ایسی خاموش  
 ہوتی کہ سناٹے کا عالم ہو جاتا۔ اس میں بھی جہاں جہاں موقع پاتی حریفانہ لطیفوں اور  
 ظریفانہ چٹکلوں سے علم کو ایسا چٹکیوں میں اڑا جاتی کہ سننے والوں کے منہ  
 میں تخمین و آفرین کا ایک حرف نہ چھوڑتی پھر ادھر سے علم اپنے ہدایت نامہ  
 کا طومار لے کر کھڑا ہوتا۔ اول تو ذکاوت کا اور اُس کے کلام کا سطرین دکھاتا  
 کہ یہ منانت سے خالی ہے۔ جو جو رنگ اُس نے جائے تھے انہیں حقیقی اور  
 تحقیقی دلیلوں سے بلکہ آیتوں اور روایتوں سے اس طرح مٹاتا کہ اہل نظر کو  
 سوائے سر بلانے اور بجا و برحق کہنے کے کچھ بن نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ  
 اہل محفل نے اپنی غلط فہمی کو چھوڑنا شروع کیا اور جب محفل کا خاتمہ کر کے  
 اُٹھے تو علم کے دلائل صادقہ کے لئے عظمت دلوں میں لئے اُٹھے۔ مگر  
 جتنی اُس کی عظمت لئے اُٹھے اتنی ہی اس کی شوخی و شگفتہ بیانی کے  
 لئے مہر و محبت لئے اُٹھے۔

جب دونوں کے کمال اپنی اپنی اعزاز و قدر دانی کے لئے اہل نظر سے  
 سفارش کرتے تھے تو حسن طلب کے انداز بالکل الگ الگ تھے ذکاوت  
 تیز اور بے باک ہو کر ایسی چمک دکھا سے آتی تھی۔ کر دیکھنے والوں کی آنکھ نہ  
 ٹھیرتی تھی۔ علم بھی آگے بڑھنا تھا۔ مگر اپنے وقار و منانت میں کمال بندوبست  
 اور نہایت روکا مقام سے قدم اٹھاتا تھا۔ ذکاوت کند ذہنی اور دیر فہمی کے

دلغ سے بہت بچتی تھی اور علم چوک جانے اور دھوکا کھانے کے سوا کسی نعمت سے نہیں ڈرتا تھا۔ ذکاوت کی طراری کا یہ عالم تھا کہ سمجھنے سے پہلے ہی جواب دے اٹھتی تھی۔ کہ ایسا نہ ہویری تیز فہمی پر حرف آئے۔ علم کی یہ قباحت تھی کہ سیدھی سی بات میں بھی اس خیال سے اٹک جاتا تھا۔ کہ حریف نے اپنی تقریر میں جو جو ٹوڑ جوڑ مارے ہیں۔ ان میں سے ایک دقیقہ بھی بے کھولے نہ رہ جائے۔ برخلاف اس کے ذکاوت علم کی ہر بحث کو جھٹ پٹ بلکہ اس گھبرائٹ سے خاک میں ملا دیتی تھی۔ کہ وہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ مگر پھر علم اُس کی بات میں اُنال کے فرق اس تفصیل سے دکھاتا تھا۔ کہ سُننے والے اُکتا جاتے تھے۔ بلکہ جن باتوں کا آج تک کسی نے انکار نہ کیا تھا۔ اُن کے ثبوتوں میں خواہ مخواہ بات کو طول دیکر وقت ضائع کرتا تھا۔ ذکاوت اپنی نود کی ہوس میں ایسی ایسی باتیں بھی پیش کر دیتی تھی کہ جنہیں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر دھچپ اور دل پسند خیالوں کو خوشنائی سے دکھا کر کامیاب بھی اس قدر ہوجاتی تھی جس کی اُسے خود بھی اُمید نہ تھی +

برخلاف اس کے علم اکثر قدمائے قدموں پر چلتا تھا۔ وہ نئے خیالوں سے بچتا تھا۔ اور ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں ان نتیجوں میں پھنس جاؤں جنہیں اُس کی نظر پیش میں دیکھ نہیں سکتی۔ اکثر ڈھب ایسے آپڑتے تھے کہ اگر ذرا ہمت کامیاب کو اور آگے بڑھاتا تو دشمن کو مار ہی لیتا۔ مگر احتیاط جو اس کا جانی رفیق تھا۔ وہ روک لیتا تھا +

حق یہ ہے کہ غلط فہمی سے دونو خالی نہ تھے۔ اور اسی نے دونو کو تیر ماے اعتراض کے نشانہ پر رکھا ہوا تھا۔ ایجاد اور اختراع تو ذکاوت کے مصاحب تھے اور قدامت اور تقلید علم سے بہت محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی واسطے ذکاوت کو تو وہی بات پسند آتی تھی۔ جو کہ آج تک کسی نے دیکھی ہو

نہ سنی ہو علم کا قاعدہ تھا کہ بزرگانِ سلف کے قدم بقدم چلتا تھا اور اُن کی ایک ایک بات پر جان قربان کرتا تھا۔ بلکہ اُس کے نزدیک جس قدر بات پرانی تھی۔ اُسی قدر سزا اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل تھی۔ برخلاف اسکے ذکاوت پڑانے پن سے بہت گھبراتی تھی اور ہر رنگ میں نیا شعبہ دکھاتی تھی اُس کا قاعدہ یہ تھا کہ دلائل سے قائل نہ کر سکتی۔ تو لطائف و ظرائف ہی سہی۔ غرض واہ والئے بنیر نہ چھوڑتی تھی۔ اور اُسے قائل کرنے کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ مگر علم اپنی رائے کو ہمیشہ ایسے سنجیدہ اصول اور پیمے تلے قواعد سے سنبھالے رہتا تھا۔ کہ اگر مقدمہ اُس کے برخلاف بھی فیصل ہو جائے۔ تو اُسکے دلائل برجستہ کو یاد کر کے مدتوں تک تعریفیں ہوتی رہیں۔

مناظرہ کے شوقینو دیکھو! اب دو نوحریف اپنی اپنی چال بھرتے ہیں۔

چند روز کے بعد اُن کی طبیعتوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ دونوں نے اپنی اپنی خاصیت اصلی کو چھوڑ دیا۔ یعنی ہر ایک یہ سمجھنے لگا کہ جو حربہ جریف نے کیا ہے۔ یہی حربہ میں کروں تو دو ٹوک فتح ہو جائے۔ یعنی اس نے اُس کے رنگ لینے شروع کئے۔ اور اُس نے اُس کے ڈھنگ پر چلنا شروع کیا۔ چنانچہ دونوں طرف سے یہی چلنا ہنسیار ہو گیا۔ یعنی کبھی کبھی ذکاوت دلائل منطقی پر بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ علم اُن دلیلوں کو پھر سمجھ کر فقط مسکرا دیتا تھا مگر اس طرح کہ اُن سب کی صورت بگڑ جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے طرفدار چلاتے کہ واہ وا دلیل کا نام بھی نہ تھا۔ یہ تو باتوں ہی باتوں کا مصالح تھا۔ ان تجربوں میں دونوں نقصان نقصان پاتے تھے۔ اور خود اپنی حقیقت کو دشمن کے ہاتھوں میں ڈال کر سبک ہوتے تھے۔ اور ذلتیں اٹھاتے تھے۔ غرض جس طرح ذکاوت کی طبیعت میں تناوت و وقار اور بات میں بوجھ بھار نہ تھا۔ اسی طرح علم کے کلام میں ظرافت کا نہک اور رنگینی کا نقش و نگار نہ تھا۔ دو قدم چلنا اور گر گریٹا +

یہ مباحثے ایسے مدت دراز تک جاری رہے کہ لازم ملزوم ہو گئے۔ اور عالم بالائیں بھی فرقی فرقی ہو کر دونوں طرف جھٹھے بندھ گئے۔ چنانچہ ذکاوت کو زہرہ نے اپنے دامن حمایت میں لے لیا۔ اور تمسّم۔ تمسخر۔ مزاح۔ دل لگی کو اس کے ساتھ کر کے کہا کہ حسن و جمال کی پیروی میں جا کر جلسے کیا کرو۔ ادھر علم پر مشتری کی نظر عنایت رہی۔ مگر وہ تو خود خشک مغز تھے اپنے محل سے باہر ہی نہ نکلتے تھے اور جب نکلتے تھے تو عصمت۔ حرمت۔ عزت۔ محنت۔ اعتدال محل تقویٰ سے روکھے۔ پھیکے۔ کبھی کبھی کے بڈھے اور پُر اتم بڑھیاں جلو میں لیکر نکلتے تھے اور کسی درگاہ یا خانقاہ تک جا کر چلے آتے تھے۔

خوش بیانو دیکھنا! طنز و تعریض کی نہ ٹھیرے۔ نہیں تو خواہ مخواہ لڑائی ہو چڑگی۔

نئی بات یہ ہوئی کہ ذکاوت کے سنگار خانے میں زیور و لباس پہنانے کے لئے دو کاردانوں کی ضرورت ہوئی۔ اور اُس میں طنز اور تعریض آکر نوکر ہو گئے انہوں نے اپنی رفاقت میں ایک شخص کو رکھا تھا کہ جسے بغض دیوزاد کہتے تھے اس کے ہاتھ میں کمان تھی۔ اور پشت پر ایک نرکش آویزاں تھا جس میں طعن و تعریض نے تیر بھرے تھے اور عداوت کے زہر میں بھجانے تھے۔ ان تیروں کا اثر یہ تھا کہ جہاں لگتے وہاں ایسے جم کر بیٹھتے کہ نہ کسی جراح کا جتن چلنا نہ کسی حکیم کا ہنر پیش جانا۔ چنانچہ جب علم کسی امر مفید یا غور کے کام میں مصروف ہوتا یا اپنے معتقدوں کو فیض علم پہنچاتا۔ یہ اس وقت ذکاوت کی طرف سے تیر مارا کرتا۔ اس کا بندوبست اور سچّہ نہ ہو سکا فقط اتنا ہوا کہ مشتری نے نمکتہ چینی اور غلط گیری کو دو ڈھالیں دیکر ساتھ کر دیا کہ اگر جواب نرکی بہ ترکی نہ ہو سکے تو اس سے روکا کرو۔ چنانچہ یہ دونو اکثر تیروں کی نوکیں توڑ دیتے تھے۔ کبھی بھال نکال کر پھینک دیتے تھے۔ کبھی اسی پر الٹ دیتے تھے۔

جب سلطان آسمانی نے دیکھا کہ ان کے آئے دن کے رگڑوں جھگڑوں سے عالم بالا کے امن میں خلل آنے لگا تو بہت خفا ہوا اور ارادہ کیا کہ ان دونو جھگڑالوؤں کو عالم خاکی میں ڈال دے چنانچہ آخر کار دونو دنیا میں آپڑے اور اپنے قدیمی جھگڑے یہاں بھی جاری کر دئے۔ یہاں دونو کے ساتھ بڑے بڑے گرجاؤں و معقد جمع ہو گئے ذکاوت نے اپنی خوشنمائی سے نوجوانوں اور رنگین مزارعوں کو بُھا لیا اور علم نے اپنی منانیت و وقار سے پُرانے پُرانے بڈھوں کو پھسلا لیا۔ ان لوگوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں نئے نئے شگوفے کھلنے لگے اور بڑے اثر اس کے ظہور میں آئے۔ چنانچہ ذکاوت کے جلوں کے لئے گلزار اور پُرے بہار سیرگاہیں سجائی گئیں کہ جو اُس کے قدر دان ہوں وہاں استقبال کو حاضر ہوں۔ اسی طرح علم کے لئے مدرسے، مسجدیں، درگاہیں اور خانقاہیں قرار پائیں۔ دونو جتنے اس پر جان دیتے تھے کہ شان و شکوہ اور ناموسری اور دریا دلی ہیں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں۔ اس طرح کہ اپنے حریت کو گرد کر دیں۔ اور اس عقیدے کے پھیلانے میں عرق ریزی کر رہے تھے کہ جو مخلوق دنیا میں پیدا ہو۔ اُسے واجب ہے کہ دونو میں سے ایک فریق میں ضرور داخل ہو۔ ساتھ اس کے یہ بھی تھا کہ جو شخص طرفین میں سے کسی کی بارگاہ میں ایک دفعہ بھی جانکلے پھر اُسے دوسرے کی نظر عنایت کی اُمید نہ رکھنی چاہئے۔ اس خاکدان ظلمانی میں ایک خاکی جماعت تھی کہ وہ دونو میں سے ایک کو بھی نہ مانتی تھی۔ یہ لوگ روتی صورت سوتی صورت۔ دولت کے بندے تھے اور اُسی کی عبادت کرتے تھے۔ زر و مال کے خزانے اُن کے عبادتخانے تھے۔ وہاں کیا علم کیا ذکاوت کسی کی بھی دُعا قبول نہ ہوتی تھی اور سبب اس کا یہ تھا کہ اُن کی آنکھوں پر روپے کی چربی چھائی ہوئی تھی اور کانوں میں غفلت کی روئی تھی ذکاوت نے اُن پر بہت بہت گل افشائیاں کیں مگر اُن کے

لبوں پر کبھی تبسم کا رنگ بھی نہ آیا اور علم نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت دماغ سوزی کی تھی مگر اُن کے طبع خوابیدہ نے پھر بری بھی نہیں لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کی آنکھیں روشن بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر دولت کا ایک مُرید خاص اُن پر تعینات تھا وہ اسی وقت اُن کی آنکھوں میں ایک سُرمہ دے جاتا تھا کہ ہر چیز اُنہیں چھوٹی اور حقیر ہی نظر آتی تھی غرض انگلی کم نظری اور بے اعتنائی علم اور ذکاوت دونوں کو بُری معلوم ہوئی چنانچہ یہ دونو متفق ہو گئے اور اپنے اپنے مقصدوں کو چرٹھا کر بھیجا۔ اُنہوں نے اسی وقت دولت پرستوں کے عبادت خانوں کا رخ کیا اور جاتے ہی کسی کے پہلو میں اشاروں۔ کنایوں کی چٹکیاں لیں۔ اور کسی کی بغل میں ظرافت کی گدگدیاں شروع کر دیں۔ اُس وقت سارے دولت پرست چونک پڑے اور جب کچھ بن نہ آیا تو گھبرا کر روپے کو مدد کے لئے بلایا۔ روپے کے پاس بڑے نقش اور منتر تھے۔ وہ آیا اور اپنے سارے ہتکھنڈے چلتر کام میں لایا۔ مگر کوئی بیچ اُس کا چل نہ سکا۔ پھر بھی اتنا ہوا کہ ذکاوت اور علم نے جو اپنے اپنے معتقد بھیجے تھے اُن میں پھوٹ ڈال دی اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنہوں نے اپنے آقاؤں کے راز کھولنے شروع کر دیے۔ یعنی جو کچھ ذکاوت اور علم تخریر کرتے یہ جھٹ دولت پرستوں کو خبر چاہ چاہتے۔ بلکہ جب کچھ تجویز دولت پرستوں کی ذلت کے لئے عمل میں آتی۔ تو یہ رشوت خوار کار گزار دل میں بُرا مانتے۔ اور اگر کچھ حکم لے کر جاتے بھی تو دولت پرستوں کے سامنے خوشامد کے پیرایہ میں ظاہر کرتے۔ وہ باوجود اُس کے دل میں اُنہیں بھی حقیر ہی سمجھتے تھے۔ جب یہ خوشامدی رفتہ رفتہ دولت اور دولت پرستوں کے درجہ عنایت تک جا پہنچے تو خوشامد کی بدولت بڑے بڑے انعام اور جاگیریں حاصل کیں۔ چند روز کے بعد ایسے بد دماغ ہوئے کہ جو اہل عنایت خود اُن کے

آقاؤں کے مصاحب تھے اُن سے پہلو مار کر چلنے لگے اور اُن کے مقابل میں اپنے تئیں بہ نظر فضیلت دیکھنے لگے ۛ

القلمہ جب ڈکاوت اور علم دونوں نے دیکھا کہ اہل دنیا کا وہ حال ہے اور جو نوکر اپنے تھے وہ سب نکھرام ہو گئے تو دونوں نے بل کر دو عرصیاں تیار کیں جن میں دولت اور دولت پرستوں کی زیادتیاں اور اپنے نمک حراموں کی بدذاتیاں سب لکھیں۔ اور سلطان آسمانی کی خدمت میں بھیج کر التجا کی کہ ہمیں ہماری قدیمی آرامگاہ میں جگہ مل جائے۔ یہ عرضی سن کر سلطان آسمانی داہنے ہاتھ کو بڑے زور شور سے گرجے۔ اس کے یہ معنی کہ ان سب کا روسیہ کرو۔ اور دونو ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس حسن طلب کو نہایت غنیمت سمجھتے اور خوشی خوشی شکرے کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہوئے ڈکاوت نے جھٹ بازو پھیلائے اور غبار سے دامن جھاڑتی ہوئی آسمان ہوا کو اڑی لیکن اُس فضا سے لا انتہا میں کہ جہاں نہ راہ تھی نہ رہنا۔ نظر دور تک کام نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے چند ہی قدم پر رستہ بھول گئی۔ علم رستے خوب جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی پر خوب بلائے۔ مگر اُن کے بازوؤں میں زہر نہ تھا چھوٹی چھوٹی اڑائیں کیا کرتے تھے۔ غرضیکہ ہاتھ پاؤں مار کر دو نو زمین پر آ پڑے اُس وقت ایک دوسرے کی مصیبت کو خیال کر کے سمجھے کہ اب اتفاق کے سوا گزارہ نہیں۔ ناچار دونوں نے ہاتھ ملائے۔ اور پھر اُسے علم کو تو ڈکاوت کی قوت پر واز کا سہارا بلا۔ اور ڈکاوت کو علم دور میں نے رستہ بتایا۔ پاک راستے سلطان آسمانی کے دربار میں جا داخل ہوئے چونکہ بگاڑ کے فریے دونوں نے خوب چکھ لئے تھے اس لئے اب کی دفعہ دونوں میں بہت محبت اور اخلاص ہوا۔ مگر ڈکاوت نے علم کو صلاح دی کہ بھائی تم ذرا حسن ظرافت اور اسکی سہیلیوں سے نشست برخواست رکھا کرو۔ اسی طرح انہوں نے ڈکاوت کو بھجایا کہ تم ذرا

صلاح و اعتدال کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر و۔ ان صحبتوں نے دونوں کی طبیعتوں میں بڑا اثر کیا۔ علم کی خشک دماغی کوشش اور ظرافت کی طراوت پہنچی۔ دکاوت کی شوخی و طاری نے صلاح سے اصلاح پائی۔ دونوں آہستہ آہستہ عالم بالا کے پریزادوں میں ایسے ہر دل عزیز ہو گئے کہ جس جلسہ میں یہ نہ ہوں۔ اس میں رونق ہی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چند روز کے بعد سلطان آسمانی کے ایام سے دونوں نے شادی کر لیں اور ان کی نسلوں سے علوم و فنون کی اولاد کے سلسلے جاری ہو گئے۔

## شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو دیکھو! اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی و فوار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں جنہوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں جنہیں اسی ہانف غیبی کا خطاب زیبا ہے۔ جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزم تحقیق کے صدر۔ اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیکیوں کی رستے بتاتے رہے۔ جس سے ملکِ فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد میں کے رہ جائیگی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے۔ یا تو ثوابِ آخرت کے لئے۔ یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے۔

لیکن میں اس دربار میں انہیں لوگوں کو لاؤنگا جنہوں نے اپنی محنت ہائے  
 عرق فشاں کا صلہ اور غزہماے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو  
 سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے۔ ان کے  
 نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔ مگر بڑا فکریہ ہے کہ جن لوگوں کا  
 ذکر کرتا ہوں ان کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ کیونکہ جن بچاروں نے ساری جانفشانی  
 اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا ان کے حصہ میں کسی طرح کا نقص ڈالنا  
 سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی  
 چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انہوں نے ایسے ایسے لوگوں  
 کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے  
 مقابلہ میں گزری۔ ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے  
 تھے کہ انہوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب  
 دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں اس لئے عرض کرتا ہوں ۛ  
 خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں۔ اور چلتے چلتے ایک  
 میدان وسیع الفضائیں جا بنگلا ہوں جس کی وسعت اور دلفرائی میدان خیال سے  
 بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ  
 نہ انہیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے نہ قلم تحریر پر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو  
 لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں  
 لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی گوشِ سحاب سے سرگوشیاں  
 کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو ایسے سر بھوڑا اور سینہ توڑ ہیں کہ  
 کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ  
 کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستوں اس رستہ کی دشواریوں کو سر بھوڑا اور

سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ مگر نری نامنصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرنے تو ان بلاؤں کو جھیلے جن پر مصیبتیں گزریں وہی جانیں۔ یکا یک قلعہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبہ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے ٹھوڑے ہی اشخاص تھے۔ جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔ یہ

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا۔ اور وہ تعجب فوراً جا نہیں رہا یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھنا ہوں کہ کچھ خوبصورت خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پریزاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت کوئی عیاشی ہے۔ کوئی خود پسندی کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی بہت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہیں میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈے سایہ کئے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ گونا گوں میوے جھوم رہے تھے طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی

نہریں۔ اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے اُبھارے بلندی کوہ کے ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ جو لوگ ان جلی پریوں کی طرف مائل ہیں۔ وہ اگرچہ اقوام مختلفہ عمدہ مائے متفرقہ۔ عمرائے متفاوۃ رکھتے ہیں۔ مگر وہی ہیں جو حوصلہ کے

چھوٹے ہمت کے سیٹے۔ اور طبیعت کے پست ہیں ۛ

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ صاحب ہمت عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شننائی کی آواز کی طرف بلندی کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادہ سے آگے بڑھے کہ بلندی کوہ پر چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نعمت آسمانی سے قوت روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزائے کسی کی بغل میں ایک کپاس تھی۔ کوئی پینسل لٹے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور ڈور بین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علم ریاضی اور جرئت ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام میں نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتہ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گر مجبوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں منقسم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لئے۔ وہ تھوڑی ہی دُور چڑھے تھے۔ کہ ان کا راستہ ختم ہوا اور وہ تھم گئے مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دستکاری کی راہ لی تھی کہ روپیہ کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے

تھا جنہوں نے دلاوروں اور جانباڑوں کے گرد کو پیچھے چھوڑا تھا۔ اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پالئے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دئے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھکر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے۔ مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتہ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی لوگ ہیں جہاں عقل صادق اور غم کامل کام دیتا ہے وہاں چاہتے ہیں کہ فقط جالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے اتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو مد روز کار سے ترقیاً حاصل کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعہ گر پڑتے ہیں اور آئندہ کے لئے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے ہم اتنے عرصہ میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے ہمارے نیچے سے چلتے ہیں اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دوگر وہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان دونو شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھکر ایک ایک بھوت ڈراؤنی صورت ہیبت ناک صورت کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ماتھے میں ایک درخت خاردار کا ٹھننا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاک تھا اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے ہمانے تھے جو اولوالعزموں کو راہ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا۔ ٹھننے کی مار سنہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خوشخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی

لہنی تختیست جو ناموسی اور ترقی کے خواہاں ہیں اگر سلطنت حکومت۔ دولت شجاعت علیت وغیرہ کے رستے سے پابستے ہیں تو خوف جان ہے۔ اگر اور فنون کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسد انواع و اقسام کی بدذاتیوں سے سدا رہا ہوتے ہیں \*

ہے ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت کے بھاگ بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ ہے ہے موت! ہے ہے موت! دوسرے رستہ پر جو بھوت تھا اُس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اُسکے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈرانی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اس کی زبان سے نکلتے تھے اس لئے اُس کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا نہ جانا تھا اُس کے سامنے ایک کچھوٹا حوض بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اڑائے جانا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے بیدل ہو کر رہ گئے اور بعض اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہو جاتا تھا اور قدم آگے نہ اٹھنا تھا۔ اتنے میں اُس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ مجھے ہونے ارادے پھر چمک اٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے اُسی قدر خوف و ہراس خاک ہو کر اڑتے گئے۔ چنانچہ بہت سے جانناز جو شمشیریں علم کئے ہوئے تھے اس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا یہ اس دہانہ سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھنا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیسے تھے وہ اُس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا مگر اس آواز کے ذوق شوق نے انہیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے کچھو میں ہناتے مریچکریہ بھی اُس کی حد سے بھل گئے چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں۔ آگے دیکھا تو ان کی دسترس سے باہر ہیں اور رستہ بھی صاف اور ہموار بلکہ ایسا خوشنما ہے کہ سا فر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگی

کو قوت دہامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا اُس کا رنگ کبھی نور سحر تھا اور کبھی شام و شفق۔ جس سے فوس قرح کے رنگ میں کبھی شہرت عام اور کبھی بقاے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوان عالیشان دکھائی دیا کہ اُس کے چار طرف پھانک تھے۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختہ میں ایک پری حور شامل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سُروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین و شاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ”خیر مقدم! خیر مقدم خوش آمدید صفا آور دید“ اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ سورتوں کا گردہ ایک دروازہ پر استادہ ہوا تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکا یک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز و جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُرنکلنے تھے۔ اب اُس سے ظفر بابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔ جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا راجہ مہاراجہ ہے چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہے۔ سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے اس کے استقلال کو دیکھ کر لنگا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اُس کی حقداری جنگل اور پہاڑوں کے جیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لٹے آتے ہیں۔ فرقہ فرقہ کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شانہ طور سے۔ لینے کو بڑھے

اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کھن سالہ۔ رنگت کا کالا ایک پونھی بغل میں لئے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور باوا زبلند چلایا کہ آنکھوں والو کچھ خیر ہے؟ دیکھو! دیکھو! تڑپ کے سلسلہ کو برہم نہ کرو۔ اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ بلاؤ۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پونھی نذر گزرائی۔ اُس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ اُس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوادار آیا۔ وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اڑ گیا معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں اور یہ والیک ہے جس نے رامائن نذر دی۔ سب لوگ ابھی والیک کی ہدایت کا شکر یہ ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو ۳۲ پریاں اڑائے لئے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقہ فرقہ کے علما اور موخ لینے کو نکلے مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بیقراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو ہمارا راجہ بکرماجیت تھے اور تخت سنگھان بتیسی۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے نہ آپ کا سنہ ہٹیکانہ سکھ مٹیکانہ۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انہیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قبیل وقال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور اراکین دربار کھتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گذرہ نہیں۔ اتنے میں وہی ۳۲ پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا

لے کوئی اوتار کتنا ہے۔ کوئی بادشاہ! اقبال +

ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیر باد کی اور بقا سے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا جس میں ہیرے اور پتے کے نودانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور ۳۲ ۳۲ پر یوں کا جھڑٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالیداس شاعر تھا۔ جس نے ان کے عہد میں نوکتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔ اس طرف تو برابر ہی کاروبار جاری تھے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازہ سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش جھاڑ فاونوس سے بقیہ نور بنا ہوا ہے ایک جوان پیل پیکر ہاتھ میں گرز گاؤسہ۔ نشاء شجاعت میں ست جھومتا جھومتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنوں تک مین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شانان کیانی اور پہلوانان ایرانی موجود ہیں کہ درفش کاویانی کے سایہ بے زوال میں لئے آتے ہیں۔ حبت قوم اور حبت وطن اس کے دایں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا۔ اور سر پر کلمہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مورتی اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے اسے بچشم تنظیم دیکھا۔ انہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھا یا جسے بجائے پاؤں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور و شور کے پڑھے۔ نہیں! بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہیگی۔ بہادر پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکر یہ ادا کیا اور گل فردوس کا ایک طرہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ الہی

یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہل محفل نے آمین کہی \*  
 معلوم ہوا کہ وہ بہادر۔ ایران کا حامی۔ شیرسیستانی رستم پہلوان ہے اور کس سال  
 بایوس فردوسی ہے جو شاہنامہ لکھ کر اُس کے انعام سے محروم رہا \*  
 بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حُسن شباب نوحیز اور ذل بہادری  
 اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو  
 چراتی نغی ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے  
 پوچھا مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے  
 موزخ اور محقق اُس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اُس تخت  
 کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیار ہوا تھا۔  
 چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سبے علیحدہ تھا۔ ایک انبرہ کو چیر کر نکلا۔  
 وہ کوئی یونانی موزخ تھا اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی  
 کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشہ کی طرف آ جاؤ  
 تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے  
 جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دئے ہیں \*  
 اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اُس پر دُش کا دیبانی

جھومتا تھا۔ مگر پھر بر! علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا  
 اپنے زخم کو بجائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔  
 جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر  
 بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تنظیم کرتا تھا۔ اس کی شرمندگی زیادہ  
 ہوتی تھی۔ وہ دارا بادشاہ ایران تھا \*  
 رفتہ رفتہ سکندر نے آواز دی ”انہیں لاؤ“! جو شخص داخل ہوا وہ ایک پیر مرد بزرگ

صورت تھا کہ مقبشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اُس کے چہرہ کو روشن

کیا تھا ہاتھ میں عصا سے پیروی تھا۔ جس وقت وہ آیا سکندر خود اٹھا اُس کا ہاتھ پکڑ کر لایا اپنے برابر کرسی پر بٹھایا۔ اور پانچ لڑائی کا سہرہ اُس کے سر پر باندھا معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اُس پر چھڑک کر کہا: ”اب یہ کبھی نہ کھلائینگے“

بعد اس کے جو شخص آیا اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیادروشن اور چہرہ فرحت رُوحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آپہنچے تھے اُن سب سے زیادہ عالی مرتبہ کے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا۔ اور بائیں پر جالینوس۔ اُس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجہ پر بیٹھ گیا۔ مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا گرد وہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے گرد لائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔ اور یہ کہہ کر اول سکندر کو آئینہ دکھایا پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبہ و عمامہ او طیل و دامامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر رو کے گئے۔ کیونکہ ہر چند اُن کے جتنے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے۔ اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر اُن میں ٹیل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ وہ شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ اُن کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علماء و فضلا کا ہولیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لئے اشیر باد کہتے آئے تھے۔ پہلا بادشاہ اُن میں مارون شہید اور

## دوسرا ماموں رشید تھا :

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا -  
 ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا۔ اور جامہ خون سے تلکار تھا۔ ہندوستان  
 کے بہت سے گراں بہا زیور اُس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا۔  
 اس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جوہرت  
 اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے۔ مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے  
 آہوں کے دھوئیں اُٹھتے تھے وہ محمود وغزنی تھا۔ بہت سے مُصنّف  
 اُس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔  
 چنانچہ ایک نوجوان حور شامل آیا اور فر دوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے  
 لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکرگزاری سے ہاتھ اُس کا پکڑا اگرچہ  
 برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب  
 ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا وہ ایاز تھا۔ اسی عرصہ میں ایک شخص آیا  
 کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا۔ مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے  
 داخل ہونے پر شعرا تو اٹاک ہو گئے۔ مگر تمام علما اور فضلائیں تکرار اور قیل و قال کا  
 غل ہوا۔ اُس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور اردو کے مقابل میں ایک  
 گرسی بھی تھی اُس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا :

ایک انہو کثیر ایرانی توراتی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے  
 مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی نعلیں  
 کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ  
 ہم معانی و مضامین کے مصوّر ہیں۔ اُن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر  
 یہ جواب ملا کہ تم مصوّر بے شک اپنے ہو۔ مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصوّر  
 ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب

ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ انوری۔ خاقانی۔  
ظہیر قاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے باقی سب نکالے گئے۔  
ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا اس میں سے آجیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں مگر  
کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانی لہراتی نظر آتی تھیں اس لئے اس پر پھر تکرار  
ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ مگر  
ملک مضامین کے خاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے اگر چند بوندیں نہ رہ آج  
کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بدنہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب چڑھیں  
چنانچہ یہ عذر اس کا قبول ہوا۔ یہ انوری تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے  
بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔  
خاقانی پر اس معاملہ میں اس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔  
چونکہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی اس لئے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں  
خلل انداز نہ ہو سکا۔ اسی عرصہ میں چنگیز خاں آیا اس کے لئے گو علما اور شعرا  
میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے  
اسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ موزخوں کے گرد وہ نے بڑی صوم دھام  
کی جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا تو اس نے فوراً شمشیر جو ہر دار  
سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونی حروفوں سے رقم تھا۔ "سلطنت میں میراث  
نہیں چلتی" علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ نصاب  
ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعر نے کہا کہ جس تصویر کے رنگ میں  
ہمارے قلم۔ یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو اس سے اس  
دربار میں نہ آنے دینگے۔ اس بات پر اس نے بھی تامل کیا اور منافع معلوم  
ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتھ نے آواز دی کہ اے چنگیز جس طرح ملک و شمشیر  
کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو

آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے۔ انہوں نے کچھ ورق دکھائے۔ کہ ان میں طورہ چنگیز خانی یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ امو کے چھینٹے دو۔ اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو ۞

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اُس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اُس کے لئے چند عیما نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اُس کے لئے بھی تکراروں کا نعل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا جس کی وضع منشرع عالموں کی تھی۔ لیکن کمزریں ایک طرف اُسطرلاب دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لگتی تھیں بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا چنانچہ انہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو شیخ بوعلی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھایا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانگے شکر یہ ادا کرتا ہوں ۞

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہا ہوا۔ کیونکہ وہ خود مؤرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا۔ اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگر اٹاوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمہیں قلم تحریر دیا ہے اسے اظہار و اقییت اور خلاق کی عبرت اور نصیحت کے لئے کام میں لانا چاہئے یا اغراض نفسانی اور بزرگانی میں؟ تمام مورخ ایک دوسرے

لے اس کے عہ میں علوم و فنون نے بہت ترقی کی تھی خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصد خانے کی تعمیر اس کی شاہد حال ہے ۞

کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے؟ اُس وقت تیمور نے ابن عربشاہ کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں بیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اُس کا نام مُصنّفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع قطع تعلق کا لباس پر میں خا ساری کا عامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا۔ یونخ اور شاعر سر جھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آ کر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدّموں میں کیا کام ہے اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے۔ اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب اُن کے انکار پر غالب نہ آتا وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا کہ اُس میں کسی کو دود۔ کسی کو شربت۔ کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کو سنی نشین اُنہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشہ مینائی اُن کا دیوان تھا جو فلک مینائی کے نام سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے۔ کہ دور سے دیکھا۔ بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں اُن کے ایک پیر مرد نورانی صورت بس کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی۔ اور خندانہ بینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھولوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے کیونکہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور اُن کی گلستاں۔ بوستاں کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی۔ لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر

اُن سے واقف تھے۔ اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے۔ وہ اُن کے شائق معلوم ہوئے باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے۔ دُنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں؟

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرہ سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اُس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو موزوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہئے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مورخ صاف اُس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی جس پر تیوری تمغا بھی لگا تھا گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا۔ مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے۔ اُس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم قدم چلینگے اور فخر کریں گے؟

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید بکلاہ آیا جس کو ابنوہ کثیر۔ ایرانی۔ تورانی۔ ہندوستانیوں کے فرقہ مانے مختلفہ کابج میں لئے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں اور رضامندی عام کی ہو چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصارے اُس کو نصارے سمجھتے۔ مگر اُس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے بد اوٹنی پر خون کا دعویٰ کیا کہ اُس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فحشیاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابو الفضل اور فیضی کی تصنیف میری سبجائی نہ کرتی۔ سب نے کہا۔ نیت کا پھل ہے؟

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا۔ اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرنا آتا تھا اس لئے بدست بھی نہ ہونا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی ۛ

شاہ جہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے موزخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت اُن عمارتوں کے فوٹو گرافتھ میں لئے تھے جو اُس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں اور سینکڑوں برس کی راد تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رمضان دہی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند سچوں کو ساتھ لئے آیا۔ کہ اپنی آنکھوں کو اور سچوں کے خون کا دعوے کرتا تھا۔ یہ شہر یار۔ شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور سچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدبختی اور خود غرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اُسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں مغز درجہ پر ممتاز ہوا ۛ

ایک تاجدار آیا۔ کہ جبہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسیخ پھیرتا جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی۔ اُس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتا لٹا ہے۔ سب دیکھ کر کہا کہ انہیں خانقاہ میں لے جانا چاہئے اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ

بنشا بہ منقطع اور مقبول نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اسے  
 اراکین دربار ہمارے ظل سبحانی نے اس کجنت سلطنت کے لئے بھائی سے لیکر  
 باپ ناک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمہارے اعتراض اسے اس دربار میں جگہ  
 نہ دینگے۔ یہ لطیفہ اس نے اس سخر اپن سے ادا کیا کہ سب سکرانٹ اور توجیز ہوئی  
 کہ تیموری خاندان کے سب سے انیر میں نہیں ہی جگہ دیدو۔ معلوم ہوا کہ وہ  
 عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خان عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈاجوان۔ دکھنی وضع۔ جنگ کے ہتھیار لگانے  
 رابگی کے سلعے تفعے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف رنگ متوجہ نہ ہونے۔ بلکہ  
 عالمگیر کچھ کنا بھی چاہتا تھا۔ گردہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اور  
 بولا کہ صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ سیوا جی تھا  
 جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے  
 ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ بھٹنوں اور مورخوں میں سے  
 کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے۔ کہ کوئی ان میں گویا اور  
 کوئی بھانڈ کوئی سخرانظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرانے ہوئے آتے تھے۔ کیونکہ ایک  
 ولایتی دلاوران کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کئے تھا۔ اس کی ہفتالی تنوار  
 سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مغل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا  
 تاج شاہی نصب تھا اور اس پر بخارا کی زیران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع  
 بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو۔ ان یہاں  
 کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور  
 نادر شاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان  
 سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

توڑی دیر ہوئی تھی جو ایک خول مند دستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی موقع اہل میں رہائے تھا۔ کوئی گلہ ستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وہد کر کے اپنا اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھ کہ جب بات کرتا تھا۔ اس کے منہ سے رنگارنگ کے پھول جھڑتے تھے لوگ۔ تھوڑے سا دن پھیلانے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے پھر بھی مشتاق زمین پر گرے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھ ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بدایعی اور بے پردائی سے آنکھ اٹھ کر نہ دیکھتے تھے شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کرنے والی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔

میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہرہ دیکھتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار تھی پر ہنر کار دم میں ڈاڑھی چٹ بناک کا سونٹا کندھے پر پڑ

جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ سیٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلمکاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی آست جہانے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے۔ مگر جب کچھ کہتے تھے برات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیرم دیرینہ سال۔ مجھ شاہی دربار کا لباس۔ جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریب بکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان کے دست و گریبان ہو جاتے۔ لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ بچا لیتے تھے۔ ہڈھے

میرامن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے۔ اور بانٹ صاحب مرزا سرور  
 فنا نہ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پندرہ عام کے عہد سے دربار مہا گیا۔  
 انہوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سووانے اٹھ کر بانٹ اشعرائی کا  
 تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے مگر ان سے نیچے  
 نہ تھے بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نفاذہ اس زور سے بجا کہ سب  
 کے کان گنگ کر دئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ  
 کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس۔ اتنے میں آواز آئی  
 کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔  
 مگر وہیں سے پھر کوئی بولا۔ کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے بیٹھ جائیگا۔ اتنے  
 میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ  
 رکھی ہے اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہئے۔ اس مقدمہ قبلِ قیام  
 شروع ہوئی میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرہ سے الٹ کر آگے بڑھوں مگر کچھ بولوں  
 کہ میرے باوقی ہمارے یعنی فرشتہ رحمت نے مانز بکرا لیا۔ اور چپے سے کہہ کر اپنی  
 مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو دیکھ کر بول گیا اور خدا کا  
 شکر کیا۔ کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی۔ مردوں سے زندوں میں نوا آیا۔

### خاتمہ

اگرچہ خیالات کے بدلے جھے ہوتے ہیں۔ اور اشخاص تصور ہی زبان ہوتا  
 ہے اجسام سے طلسمہ کاری کرتے ہیں لیکن سو کے قریب سننے سے یہ ہونچکے۔  
 اب جلسہ ختم۔ اور کچھ غزلہ کے لئے کلام کا دروازہ بند۔ اسے اہل انجمن! آپ  
 آنا۔ مبارک آنا۔ قدم پر پیشہ مگر جلسہ آئندہ کی ابھی نے گزارش قبول ہو  
 کہ حضتہ دوم کا سامان ہوا ہے۔

## نظم اردو

۸ مئی ۱۹۵۷ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں مدہ یادگار سمجھا جانے لگا۔ نظم مذکور کی آگ ایک حقیق سے نکلی تھی جس کا ایک پرزہ شعراے آتش بیان کی طبع روشن تھی۔ دوسرا پرزہ امرائے زندہ دل کی گرم طبیعت۔ ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدہ کو ذوات دی۔ اور دوسرے کی قدر دانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔ مخدوق مذکور اُس حالت میں پڑھیا ہو کر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ بہن معمولی مضمون تھے جو پہلے استادوں نے نکالنے تھے موجودہ شاعر چبانے ہوئے نواہوں کی طرح انہیں لیتے تھے الفاظ اول بدل کرتے تھے۔ اور پرزہ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب اثر کٹر بہادر نے سال مذکور میں میرے استاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ انہوں نے اس طلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا۔ اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضورِ ندوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ اہل علم اہل فوق جمع ہوئے۔ نشر اور نظم مذکور پڑھی گئی۔ اور سب سے صلاح کر کے ایک مشاعرہ قائم کیا۔ کہ شعر اہم قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ ۱۱ مئی تک مشاعرہ قائم رہا۔ اس وقت نظم مذکور کی شروع پر لوگوں نے کچھ کچھ مخالفت کی۔ مگر ۱۴ برس کے عرصہ میں اتنا اثر ہوا کہ اب ہندوستان کے مشہور شہروں میں ویسی ہی نظموں کی آوازیں آتی ہیں۔ لکچر اور مثنوی مذکور اب نہیں ملتی۔ اور لوگ طلبگار ہیں۔ چونکہ یہ تاریخی مطلب ہے۔ اس کے حرفوں کو سننے دینا نہیں چاہئے۔ اس لئے اس کتاب میں لکچر مذکور کا درج کرنا مصلحت ہے تاکہ نئی نسل کے خیالات میں وسعت پیدا کرے۔

راقم بندہ غلام جبار رنشار شاگرد حضرت آزاد

## مضمون لیلچر

اے حاضرین باتملین! آج میں ایک ایسے امر پر گفتگو کرنے کو حاضر ہوں جو میں فرض دینا میری حد سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں اس ملک وسیع کی زبان سے متعلق ہے جسے اہل عالم مہمکت ہندوستان کہتے ہیں۔ اس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حُبّ الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی۔ امر مذکور کیا ہے؟ نظم اور انشا پر دازی اردو زبان کی ہے۔ جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب اور عام تصنیفات اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ اس وقت یہ موقع نہیں۔ کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کر کے پُرانی بنیادیں نکالی جائیں اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے جس میں فارس کے مسافرنے آکر عمل دخل کیا۔ اور صاحب نامانے اس بن بلائے مہمان کو اپنی وسعت اخلاق سے اس کے خاطر خواہ بنا دیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے ہمدین عام زبان تھی۔ مگر درباروں اور علموں پر ماں کا قبضہ تھا۔ یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بدایت کے دریا ٹوٹتے تھے۔ اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گندوں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سووے سلف کے لین دین سے خاص عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔ چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی۔ اس واسطے اس میں ستارہ اور تشبیہ سے انشا پر دازی کی باریکیاں اس امر پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں یہاں پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی۔ جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں۔

جب بھاشا سے اردو پیدا ہوئی تو کئی سو برس تک اس میں باتیں ہی باتیں رہیں یعنی شہزادہ تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگ

کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ پریشاں شعر تو کسی سو برس سے اردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہجہاں کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی تو وئی شاعر پیدا ہوئے اور ساتھ ہی جا بجا دیوان تزییب ہونے لگے۔ اردو کی مالک ان لوگوں کی اولاد تھی۔ جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے۔

اسی واسطے انہوں نے نام فارسی بکریں اور فارسی کے وچسپا اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پر وازی کا فوٹو گراف فارسی سے اردو میں آ کر لیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش آوائی اور خوشنائی پیدا کی۔ کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے انہیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ ناسخ عامہ پیسے اور کونوں کی آواز اور پنپنا۔ چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔ ہزارہ و بلبل اور سرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں ان کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم و اسفندیار کی بہادری کوہ الوند اور بے ستون کی بندی۔ جیون۔ جیون کی روانی نے یہ لوفان اٹھیا کہ ارجن کی بہادری ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں اور گنگا جمنائی روانی کو بالکل روک دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہئے کہ اس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہو گیا۔ اس کے استعارہ اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نقل و نشر آئے ہیں۔ جہاں کئے چمن میں باریک باریک۔ استعاروں کی نیم نوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لئے انہیں پھوپھوں فاعط اس زبان میں آیا بیشک ان کی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجہ پر ہے اس کی مدد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو تو باریکی اور تازگی کی الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگہ ہے کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب۔

اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اُسے۔ قافیوں کے پیروں سے فز کر تے گئے۔ لفظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم کسی شے پر غمت یا اس سے نفرت کسی شے سے خوف یا خطر۔ یا کسی پر تہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اُس کے بیان سے وہی اثر۔ وہی جذبہ۔ وہی جوش اُسنے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بیشک سب لفظ کا زور۔ تشبیہ اور استعارہ کا نمک۔ زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرنا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک تشبیہ اور استعارہ ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اُس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے۔ نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے۔ تو دیکھیں گے۔ کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار طرے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔

اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس گنتا ہوں۔ نہیں۔ اُس نے اپنے بزرگوں سے لیسے۔ لیسے۔ خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے مگر کیا کرے کہ خلعت پرانے ہو گئے۔

اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے  
معتابین اور نئے انداز کے موجد رہے۔ مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج  
کے مناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں گھر  
ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے مہوطن انگریزی انوں  
کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے یعنی اے انگریزی  
کے سرمایہ دارو! تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں  
افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے۔ اور تمہیں  
اس کا درد نہیں آتا۔ اپنے خزانہ اور نئے توشہ خانہ سے ایسا بندوبست نہیں  
کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل  
ہو۔ یہ وطن کا فرض ہے کہ قرض سے زیادہ اس کا ادا کرنا واجب ہے۔

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا اور اس سے نظم اور انشاے اُردو نے  
ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ ان لوگوں کی بدولت ہوئی کہ بھاشا اور فارسی  
دونوں سے واقف تھے۔ تم خیال کرو کہ جو اس وقت بھاشا اور فارسی کا حال  
تھا۔ آج بعینہ اُردو اور انگریزی کا حال ہے۔ پس اس کی نظم میں اگر انگریزی کے  
خیالات کا پرتوہ حاصل ہوگا۔ تو انہی لوگوں کی بدولت ہوگا جو دونوں زبانوں سے  
واقف ہونگے۔ اور سمجھیں گے کہ انگریزی کے کون سے لطافت اور خیالات ایسے ہیں  
جو اُردو کے لئے زیور زیبا بن سکتے ہیں۔ اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا  
افسوس اس بات کا ہے۔ کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش اور لطافت  
و صنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں۔ کہ تمہاری زبان  
کسی سے کم نہیں۔ کسی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر چڑھوس  
ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں۔ جس میں کچھ وصل کا لطف۔ بہت سے  
حسرت و ارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار خزاں۔

فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں۔ اور فخر کی موچھوں پر ناؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود اثراتوں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اٹھا سکتے یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی طلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدرزا ہو جاتے ہیں۔

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جو اہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے بے جگہ لٹاتے ہیں کیسی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پر افسانہ کرتے ہیں۔ لیکن میں کیا؟ سن کر ترسیں اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم کو کوئی چھوٹی نثر لکھتے ہیں اتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے جسکے اعلیٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے بزرگ و دہشت و قافیہ کے ساتھ ایسی دلپسند بجزیں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

اسے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہے گا۔ وہ جس کی یہ ہے کہ بہ سبب بیقدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پُرانی تو تین تہائی ہیں۔ وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ابک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی۔ اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا۔ میرے اہل وطن! آؤ آؤ براے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اٹھو اٹھو وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری

کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی۔ کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی۔ اور اس ضمن آباؤی۔ اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ سردست یہ کام کچھ مشکل ہے۔ کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے۔ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحرالبیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کر کے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کر کے بہائے ہیں۔ جب یہ دلپند خیالات شستہ الفاظ۔ پاکیزہ ترکیبیں خوشامترائشیں مضمون کی گرمیاں۔ انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں۔ کہ سننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے۔ کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان میں سے جس کو چاہے لے لے اور ان پر شاعری خرچ کر کے وہ ہی لطف کلام میں پیدا کر لے۔ تو آج نہایت مشکل بات ہے۔ تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکر کیے ان مزاروں پر پھول برساتے ہیں جن کے سونے والوں نے انہی چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں۔ جو ویسے لوگ پیدا ہوں۔ ویسی کوششیں کریں۔ اور ویسے ہی لطیف اور خوش آئندہ انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں۔ تو بھی ہمیں مایوس نہ ہونا چاہئے۔ اگر کوشش کریں گے تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھیں گے۔ کیونکہ دلی دن بھر میں گلزار نہیں ہو گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک ان احاطوں کو آباد کر رہے ہیں۔ وہ خود اس قیامت کے مضمون میں جن میں شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذت کم ہو۔ تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی سے رنجک کی طرح شعر کو لے اڑنے ہیں۔ البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک قدرتی قوت زبان دیبان کی اور اصلی فصاحت

اعلیٰ درجہ کی چاہئے۔ تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرامے جسے سننے والے کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے۔ مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھنا ہوں آج کل ہماری گورنمنٹ اور اُن اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارہ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کریگی :

میرے اہل وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو۔ کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں۔ کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوتِ نظم خود حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اُس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ طب۔ منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا۔ نظم کی جستری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جہرِ بلقان آج کی اصل عرب۔ عربی وہ زبان ہے کہ جس میں مرد تو بالائے طاق گھروں کی عورتیں۔ بلکہ لوندیاں جب اپنی جوشِ تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا کلام ایک پروردہ نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں۔ کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرفِ تاثیر سے خالی ہو۔ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ آوروں کے سامنے ہماری زبان ضعفِ بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاکِ ہندوستان اگر تجھ میں امر القیس اور لبید نہیں۔ تو کوئی کالیڈاس ہی نکال۔ لے ہندوستان کے صحرا و دشتِ فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی و الیک ہی پیدا کر دو :

جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری کے لئے اول قدرتی جوہر بعد اُس کے چند تخصیصی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوقِ کامل اور شقِ دوامی ہیں شر

گئے میدان میں بھی سوار نہیں۔ پیادہ ہوں۔ اور نظم میں خاک افتادہ۔ مگر سادہ لوحی نیکو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آجکل چند نظمیں مشنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں۔ جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہونا ہوں۔ اور ایک مشنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے۔ اس وقت گزارش کرتا ہوں :-

## شام کی آمد اور رات کی کیفیت

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو ہیں روز و شب زمانے کے سپہ قدم تھے کلفت سے دن کی ہو گیا نہ تیرا زد ہے ہوتا زمانہ بسکہ ہے دابستہ شام سے

عالم کے کاروبار میں دن بھر پھر رہے تو پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش کم ترے اور ڈالی اُس پہ شام نے غربت کی گرد ہے اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامان کو ہسار میں اب جا کے سو رہو  
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہاں ہیں جو کچھ کہتے سفید وسیہ آشکار تھے دو لاب چرخ پر مگر اپنا مدار ہے دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے

اور روشنی تھی عام زمیں آسمان میں جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے چلتا اسی پہ دُور خزان و بہار ہے اور رات کو بنایا ہے آرام کے لئے

رضعت ہو تو کہ آتی شبِ مشک ریز ہے  
پھر صبح اُٹھ کے چلنا گریزا گریز ہے

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلایے شب ہے تو آمد کی تیری شان تو زیب رقم کروں

عالم میں شاہزادی مشکیں نسبت ہے تو پر اتنی روشنائی کہاں سے ہم کروں

<p>اُڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا لہرانا پر نیان و حریر سیاہ میں فرماں نشان میں یہ اُڑیکا جہان پر</p>	<p>ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا تھا دن مگر ہا وہی عالم نگاہ میں چھلیکا لشکر اب جو نرا آسمان پر</p>
<p>تصبح ہووے کارگہ روزگار بند آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند</p>	
<p>ہر گہر اُس میں ملک حبش کا خراج ہے ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں</p>	<p>اے رات سنتا ہوں کہ تھے سر پہ تاج ہے لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں</p>
<p>اس رنگ پر دکھا رہی کیا آب و تاب ہے تیرا چمکتا چہرہ سیاہ آفتاب ہے</p>	
<p>ہاتھوں سے مشک اُڑاتی ہے عنبر بکھیرتی کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری تکت کی قسم اور آسمان پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے مار ہے</p>	<p>عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی دُنیا پہ سلطنت کا ترمی دیکھ کر حشم روئے زمیں پہ چل رہے تیرے چراغ ہیں بجلی ہنسنے تو مریخ نرا دیتا بہار ہے</p>
<p>سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر چورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر</p>	
<p>اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر دامان دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے چو کا ہے بلکہ راہزن نابکار بھی عورت ہے یا کہ مرد جو اں ہے کہ پیر ہے سب آگے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں</p>	<p>چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی سوتا گدا ہے خاک پر اور شاہ تخت پر ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے گھوڑے پہ اپنے اونگ گیا ہے سوار بھی القصد ہے امیر کوئی یا فقیر ہے بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں</p>

<p>جس کو پکارو وہ سوئے خوابِ عدم گیا دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہوتھم گیا</p>	
<p>دہ آفتاب تھا جو چمکتا جمان پر کھولے ہوئے شفق کا نشانِ زرق برق اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے</p>	<p>بیٹھا تھا جس کا سکہ زمیں آسمان پر رکھ کر کرن کا تاج بٹکتا تھا شرق سے سکہ ہے اب ستاروں کا اوزیر نام ہے</p>
<p>محنت مٹر تھا اس کا تو راحت ہے پھل تیرا چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل تیرا</p>	
<p>مزدور جا بجا۔ تھے جو دکھ درد پار ہے بارگراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں</p>	<p>اور پاؤں تک سروں کے پینے بہا ہے جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں</p>
<p>اے شبِ تمام دن کی مصیبت سے بار کے تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پار کے</p>	
<p>دن بھر کے ہیں مسافرِ محنت زدہ بہت آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر</p>	<p>آوارہ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اتار کر</p>
<p>اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے</p>	
<p>اس دم امیر زادے کئی بے نظیر ہیں دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اور ہے اک گلغدار سامنے سرگرم ناز ہے</p>	<p>مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں پردہ میں شب کے بادہ گلگلوں کا دور ہے اور جام دے رہی نگہ نیم باز ہے</p>
<p>کھٹے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں اور وصل کے بچھونے میں پویند ہوتے ہیں</p>	
<p>اکثر امیر بیٹے ہیں نعمت کے ناز میں سامانِ عیش سب ہیں مہتاب کئے ہوئے</p>	<p>پردل کو ان کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لے ہوئے</p>

<p>مخل کا فرش ہے۔ مگر آرام ہی نہیں چھپکے پلک۔ سواس کا کہیں نام ہی نہیں</p>	
<p>ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت ہے ہیں دن ہوئے یا ہورات انہیں کام کچھ نہیں</p>	<p>آرام نے دئے ہوئے ساماں بہت ہے ہیں اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں</p>
<p>وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹینگے رات کو</p>	
<p>اور ان کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے تھا صبح دم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو اب اپنی نانِ خشک کو پانی میں چور کر</p>	<p>دن بھراٹھا تا بوجھ وہ آفت نصیب ہے وہ حق حلال کر کے گھر آیا ہے شام کو کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر</p>
<p>سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں</p>	
<p>یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے بندے خدا کے ایسے یہاں بیشمار ہیں کیجئے ذرا خیال کہ ملائے نکتہ داں کرتا نظر ہے سنن پہ بھی حاشیہ پہ بھی ہر لفظ کو پہناتا ہے معنی نئے نئے لیکن کبھی مقاصدِ اصلی سے چھوٹ کے</p>	<p>وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں بیٹھا ہے سر جھکائے پائے چراغداں مضمون جو ہمدگر ہیں اُبھتے کبھی کبھی دکھلاتا زور طبع ہے یعنی نئے نئے کرتا ہے آپ رد و قبح جھوٹوٹ کے</p>
<p>بیٹھا حرام کر کے ہے آرام و خواب کو کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو</p>	
<p>ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں رمل کے باد کرتے ہیں آپس میں دُور سے کر لیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے</p>	<p>کل صبح امتحاں ہے سوا کے خیال میں پڑھتے جُدا جُدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے کل صبح اپنی جان ہے اور امتحاں ہے</p>

<p>جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ تہمت سے دُور ہے          قیمت تو ہر طرح ہے۔ پرمخت ضرور ہے</p>	
<p>اور وہ جو لکھتی ہے مہاجن جہان میں          گنتی میں دام دام کے ہے دم دٹے ہوئے</p>	<p>آدھی بجی ہے پردہ ابھی ہے دکان میں          بیٹھا ہے گود میں ہی کھانا لٹے ہوئے</p>
<p>ہے سارے لین دین کی میزوں تمام کی          لیکن غضب ہے، بدھ نہیں ملتی جھدام کی</p>	
<p>اور دیکھنا بخونٹی وانا کی شان کو          اک آنکھ دُور بین پہ ہے اک کتاب پر          کسٹی ہے اُس کی تارے ہی گن کر تمام رات          پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں</p>	<p>ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو          ہے مٹھو اپنے زاخچہ میں اک حساب پر          پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات          نکلے نئے ستارے سر چرخ پر ہیں</p>
<p>اک جہتری بناؤں کہ طرز جدید ہو          چلے جو اُس میں اپنا ستارہ تو عید ہو</p>	
<p>اے رات تیرے پردہ دہان کی اوٹ میں          بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے          اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹیڈل کر</p>	<p>دردِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں          اور ہاتھ ڈالا اسکے ہر اک بین آن میں ہے          ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر</p>
<p>لے جائیگا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئیگا          دیکھو۔ کمایا کس نے ہے اور کون اڑائیگا</p>	
<p>اس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے          ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے          لانا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر          پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پرافسون نئے نئے</p>	<p>بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے          اڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے          جانا زبیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر          ہو جاتے ہیں وہی دُرمضوں نئے نئے</p>
<p>مضمون نازہ گر کوئی اُس آن بل گیا</p>	

یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا	
پھر تا ٹوٹنا ہوا مانند کور ہے لاتا پرایسے ڈھبے لافا بدل کھے	اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے مطلب اُراتا شعرے مضمون غزل سے ہے
تعریفیں اسکی کرتے ہیں جو شعر مانتے ہیں مضمون گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں	
آزاد سر چھکائے خدا کی جناب میں اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض	عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں پھیلانے لگا تھا صورتِ اُمید وار ہے مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
یار ب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے	
کرتا ہے اس کو خرچِ عدو کے علاج میں اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے	آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں کرجاتا صاف دشمن بد میں پہ چوٹ ہے
کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے	
سجاوہ سیاہ بچھایا ہے تان کر بیٹھا رہ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے اور دل میں دم بدم ہے نگاہ دو لگی ہوئی	اے رات یہ جو تو نے سر شام آن کر اور اُس پہ حق پرست کر یاو خدا میں ہے اس کو اسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی
کب تک رہے جناب گلا گھوٹ گھوٹ کر اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر	
اہل جہاز جن کا خدا کا ساز ہے کچھ ستر تین میں ل میں کچھ ارماں لئے ہوئے پردل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے	دریا میں چل رہا کہیں دم جہاز ہے بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں ل دئے ہوئے باو مراد دیتی ہو اے مراد ہے

آنکھیں سبھوں کی لگ ہی ہیں باوبان پر	اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں میٹھے ہوا کی امید پر	لے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر
دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے	ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک ہی	بچہ کو ہاتھ سے ہے برابر پھینک رہی
اور کمتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے	ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے
ماں کو تو سونے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے	کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے
پر جلے حیف حال اسی جان بلب کا ہے	سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شرب کا ہے
دین بھر دو اغذیاں میں رہا غیر حال ہے	لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے چھللا رہی	اور یکسی سر مانے ہے آئینہ بہا رہی
لے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے	اس کی تو زندگی کوئی دم کا تھا ہے
کون اس کا ساتھ دیو یگا صبح جب تلک	رو یگا کوئی شام کے مردے کو کب تلک
آزاد آفریں تری لطفت زبان کو	پر کروٹ اب رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں دل دئے ہوئے	تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پئے ہوئے
کوئی گھڑی تو ہوش دخر دے بھی کام لے	وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

# شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آندوموم کی تصنیفات

زبانِ فارسی کی ایک مکمل تاریخ ہے مصنف نے پندرہ برس

کی محنت میں اسے تیار کیا ہے۔ نہایت قابلِ قدر اور دلچسپ کتاب ہے۔ مختلف زبانوں کے مقابلہ سے قوموں

## سخندانِ فارس

کے باہمی رشتوں کے بیٹے ہوئے سراغ دکھائے ہیں۔ ژند۔ پہلونی۔ درسی۔ سنکرت

کے الفاظ کا مقابلہ کر کے تاریخی نتائج نکالے ہیں۔ ایران کے رسم و رواج قدیم کا مقابلہ

ہندوستان کے ساتھ کیا ہے۔ اور اپنی سیاحتِ ایران کے دلچسپ حالات موقعِ موقع پر

درج کئے ہیں۔ مشہور مصنفین کے کلامِ نظم و نثر کے ماہ الامتیاز دکھائے ہیں حصہ اول

جو پہلے مطبعِ رفاهِ عام سے مختصر رسالہ کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اصل کتاب کی ابتدائی

تہذیب تھی۔ اب مکمل کتاب چھپی ہے۔ زبانِ فارسی کی ایسی تاریخ آج تک ہندوستان میں

نہیں لکھی گئی۔ مولانا آزاد کا ایک نوٹ جو لندن سے چھپو کر منگایا ہے۔ اول میں لگادیا

ہے۔ اعلیٰ درجے کے ڈائی کاغذ پر تقطیع ۲۶×۲۰۔ حجم ۴۲۴ صفحہ۔ قیمت ۵

فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے ایک مفید رسالہ ہے مصنف

نے سیاحتِ ایران میں جو مختلف اشخاص سے گفتگو میں کیں سفید

## قدیم پارسی

کارآمد ہیں تمام اس میں درج ہیں۔ زمانہ حال کی فارسی کا بہت

اچھا نمونہ ہے۔ سفید ڈائی کاغذ پر تقطیع ۲۹×۲۲ چھوٹی حجم ۲۲۰ صفحہ۔ قیمت ۸

تعلیمِ نوان کی نسبت ایک میاں

بیوی کی دلچسپ بحثِ آسان اُردو

زبان میں۔ لڑکیوں کے پڑھنے

## رضیخت کا کرن پھول

کے لئے مفید اور مناسب ہے۔ تقطیع ۲۹×۲۲ چھوٹی۔ حجم ۱۱۰ صفحہ قیمت ۴

# دیوانِ ذوق

عالمِ شعرا کا قافی ہند  
شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ

کا کلام انشا و موصوع و فنی سو دوسوں سے جمع کیا ہے۔ سوانح عمری اور اکثر غزلیات، قصائد  
کے متعلق و بچپ نہ ملانا آزاد نے خود لکھے ہیں۔ ڈومانی کاغذ، تقطیع ۲۶ x ۲۰۔ حجم ۴۴۴۔ صفحہ قیمت ۴۸

پر دینسر آزاد کی چند مثنویاں جو لاہور کشناسما کے شاعرہ میں پڑھی گئی تھیں۔  
اور دیگر متفرق غزلیات۔ قصائد۔ اشعار۔ رباعیات وغیرہ رسالہ کی صورت میں  
شائع کئے گئے ہیں۔ ڈومانی کاغذ پر تقطیع ۲۶ x ۲۰۔ حجم ۳۶۴۔ صفحہ۔ قیمت ۸ +

## نظمِ آزاد

تذکرہ شعراے اردو۔ پہلے ۸ دفعہ چھپ چکا ہے۔ اب اعلیٰ  
درجے کے سفید دلایتی کاغذ پر بہت خوشخط چھاپا ہے۔ کتاب

کے اول میں مصنف کا فوٹو ہے۔ تقطیع ۲۶ x ۲۰۔ حجم ۵۶۸۔ صفحہ۔ قیمت ۴۸ +

## آبِ حیات

جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان اور اسکے امرا سے  
جلیل القدر کے دلچسپ حالات۔ اصل میں یہ کتاب اس

عہد کی ہندوستان کی تاریخ ہے۔ پہلے ایک دفعہ چھپی تھی۔ اب دوسری مصنف کے  
اصل سووہ کے مطابق چھپی ہے۔ اور جو تغیر و تبدل پہلے ادیشن میں کیا گیا تھا اس میں  
نہیں ہے۔ مصنف کا فوٹو گراف اول میں لگایا ہے۔ اعلیٰ درجے کے سفید دلایتی کاغذ  
پر تقطیع ۲۶ x ۲۲۔ حجم تقریباً ۸۵۰۔ صفحہ۔ قیمت ۴۸ +

## دربارِ اکبری

کتاب مذکورہ بالا صحت ہماری دکان سے نقد قیمت پر یا بذریعہ ویڈیو پلے بل کی سکتی ہیں ہر ایک کتاب  
کی ۲۵ جلد یا زیادہ۔ کے خریدار سے منقول رعایت کی جائیگی۔ علاوہ کتب مذکور کے ہماری دکان سے  
ہر قسم کا سامان پیشینہ سہی۔ اعلیٰ درجے کے خط کے کاغذ۔ لفاظ۔ کارڈ۔ سکولوں کی کاپیاں۔ قلم۔

دربارِ اکبری میں سیل سامان نقشہ کشی وغیرہ اور جگہ سے ارزان مل سکتا ہے +  
خلیفہ سید محمد سالم منیر آزاد بک پبلیکیشنز لاہور













